بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمدللہ وکفی و سلام علی عبادہ الذی اصطفی امابعد

فتنہ انکار حدیث اپنی ذات میں کوئی نئی اور انوکھی چیز نہیں ہے کیونکہ عہد رسالت مآب ﷺ کے بعد سب سے پہلے معتزلہ کا جو فرقہ مسلمانوں سے علیحدہ ہوا اسکی بنیاد انکار حدیث ہی تھی اور اسکے بعد سے آج تک جتنے بھی فرقے بنتے رہے ان سب کی بنیاد میں انکار حدیث کسی نہ کسی طور پر موجود رہا ہے یعنی یہ تمام باطل فرقے درحقیقت معتزلہ ہی کی روحانی اولاد ہیں جبکہ ان تمام فرقوں کے علی الرغم ایک گروہ اہل سنت یا اہل حدیث یا محدثین کا ہمیشہ موجود رہا ہے جو دین میں قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث کو بھی حجت تسلیم کرتا ہے اور ان کے نزدیک احادیث کے ردوقبول کا معیار صرف صحت وضعف ہے یہی وجہ ہے کہ جو احادیث بارہ سو سال قبل صحیح اور مقبول تھیں ان کا صحیح ہونا آج بھی مسلّم ہے کیونکہ ان احادیث کو جرح وتعدیل کے معیار پر پرکھنے کے بعد قبول کیا گیا تھا جبکہ منکرین حدیث یا انکار حدیث کی طرف مائل جو بھی فرقے ہیں انکے نزدیک احادیث کے ردوقبول کا معیار کبھی عقل، کبھی فلسفہ، کبھی سائنس، کبھی کسی خودساختہ امام کا عمل اور کبھی اپنا ذاتی فہم قرآن ہوتا ہے اسی سبب معتزلہ سے لیکر پرویزیوں تک ہر فرقہ کا احادیث کے ردوقبول میں ہمیشہ اختلاف ہی رہا ہے کیونکہ ہر فرقہ کے بانی نے صرف ان احادیث ہی کو قبول کیا جو اسکی اپنی عقل، اپنے مخصوص فلسفے اور اپنے ذاتی فہم قرآن کے مطابق تھیں جبکہ دیگر تمام احادیث کو ظنی اور مشکوک قرار دیکر رد کردیا گیا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ایسے فرقوں کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

﴿ ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نومن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا ☆ اولئک ھم الکافرون حقا واعتدنا للکافرین عذابا مھینا ☆ سورۃ النساء آیت ۱۵۰،۱۵۱ ﴾

یعنی ’’بے شک جولوگ اللہ اور اسکے رسول کا انکار کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسول کے درمیان تفریق کردیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان میں کوئی راستہ بنائیں، (جان لوکہ) یہی لوگ حقیقی کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ذلت آمیز عذاب تیار کررکھا ہے‘‘ اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض پر ایمان لانے اور بعض سے کفر کرنے والے کو حقیقی کافر قرار دیا ہے اور بعض کی تفسیر میں تمام باطل فرقے شامل ہیں مثلاً وہ جو قرآن کی بعض آیات کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں جیسا کہ شیعہ حضرات کرتے ہیں اور وہ جو قرآن کو مانتے ہیں اور احادیث کا کلی طور یا جزوی طور پر انکار کرتے ہیں جیسا کہ اہل قرآن اور پرویزی گروپ کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اسکے رسول کی بات کو ایک وحدت قرار دیا ہے جس میں تفریق ممکن نہیں ہے اسی طرح اس آیت کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو قرآن کی بعض آیات یا بعض صحیح احادیث کی ایسی تاویل کرتے ہیں جوانکے امام کے قول کے موافق ہوجائے اور اگر موافق نہ ہوسکے تو اس آیت یا حدیث کو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ تسلیم کرنے سے انکار کردیں یہ عمل مقلدین حضرات کرتے ہیں اور اس سارے عمل کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ کسی بھی طرح اپنے عقیدے، نظریہ یا کسی شخصیت کی بات کی تائید دین سے حاصل کی جائے لیکن یہاں ہمارا موضوع بحث صرف غلام احمد پرویز صاحب کے نظریہ تقدیر کا جائزہ لینا ہے چناچہ اسی اعتبار سے ہم اپنا جائزہ اور تنقید پرویزی نظریات تک ہی محدود رکھیں گے۔

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں یہ بات ابتدائی طور پر جان لینی چاہیے کہ اس مسئلہ کا بعض دیگر بنیادی نظریات سے براہ راست تعلق ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کو خیر وشر کا خالق ماننا، ابلیس وشیطان کے وجود کو تسلیم کرنا اور جزاء وسزا اور جنت وجہنم پر ایمان یعنی اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کو تسلیم کرنا وغیرہ لیکن پرویز صاحب ان میں سے اکثر کو قطعی طور پر تسلیم ہی نہیں کرتے جیسا کہ ابلیس کا وجود جس کے بارے میں پرویز صاحب کا یہ نظریہ ہے کہ اس سے مراد انسان کے سفلی جذبات ہیں اور جنت اور جہنم سے مراد اس دنیا کی زندگی ہی مراد لیتے ہیں اور آخرت اور جزاء وسزا سے متعلق آیات میں سے اکثر کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کرکے کوئی مفہوم بیان کیئے بغیر گذر جاتے ہیں اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کو صرف خیر کا خالق مانتے ہیں شر کا خالق

نہیں مانتے مثلاً سورۃ الفلق میں ''من شر ما خلق'' کی تشریح کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿اس نے کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے اسے اس کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق مصرف میں لایا جائے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر اسکا استعمال غلط طریق سے کیا جائے تو اس سے شر پیدا ہوتا ہے ☆مفہوم القرآن ص ۱۴۹۸﴾

یہی عقیدہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے جہاں اسی آیت میں لفظ ''شرّ'' کی قرأت ''رٍ'' کی تنوین یعنی دو زیر کے ساتھ مذکور ہے جس کے اعتبار سے اس آیت کا معنی ہوگا کہ ''میں پناہ مانگتا ہوں اس شر سے جس کو اللہ نے پیدا نہیں کیا'' ملاحظہ فرمایئے تفسیر نسفی اور مناقب ابوحنیفہؒ للکرادی، بہرکیف مسئلہ تقدیر کے حل کے لئے جن فکری بنیادوں کی ضرورت ہے وہ پرویزی نقطہ نظر میں سرے سے ہی مفقود ہیں اسکے باوجود پرویز صاحب کی کتاب التقدیر کے سرورق پر جلی حرفوں میں لکھا ہے کہ ''دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا قابل فہم، بصیرت افروز حل'' چناچہ اس قابل فہم اور بصیرت افروز حل کی بنیاد پرویز صاحب نے جن نظریات پر رکھی ہے ان میں سب سے پہلے نمبر پر ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہے، دوسرے نمبر پر سائنس کے مروجہ قوانین ہیں اور تیسرے پرویز صاحب کا اپنا ذاتی فہم قرآن جسکے یقینی ہونے کا خود ان پرویز صاحب کو بھی یقین نہیں جو حدیث کے ظنی ہونے کی وجہ سے احادیث کو قطعاً قابل التفات نہیں سمجھتے اس کا ثبوت پرویز صاحب کی اکثر کتابوں کے سرورق پر درج یہ عبارت ہے کہ ''فکر قرآنی کے لئے پرویز سند نہیں، میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں آپ کے لئے ضروری نہیں کہ آپ اس سے متفق ہوں'' یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے فہم قرآنی کے ماخذ کا بھی تذکرہ کر دیا جائے تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ پرویز صاحب کے فکر قرآنی کی بنیادیں کس قدر مستحکم اور معتبر ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

﴿میں قرآن کریم کے ترجمہ کی ان مشکلات پر ایک مدت تک غور کرتا رہا اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ کرنے کا کام یہ ہے کہ:

اولاً : عربی زبان کی مستند کتب لغت و تفاسیر کی مدد سے قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ متعین کئے جائیں اور اسکے لئے جہاں تک

پیچھے جا سکتے ہوں جائیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ نزول قرآن یا اس سے قریب تر زمانے میں ان الفاظ سے بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

ثانیاً: پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ کو کن کن معانی میں استعمال کیا ہے اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بات کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے اوران تمام مقامات کو بیک وقت سامنے لانے سے ان الفاظ کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

ثالثاً: جن الفاظ کو قرآن کریم نے بطور اصطلاح استعمال کیا ہے ان کا مفہوم بھی قرآن سے متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ان جامع اصطلاحات سے اپنی تعلیم کے کس قسم کے تصورات پیش کرتا ہے ☆ ملاحظہ فرمایئے مفہوم القرآن صفحہ ۲۱،۲۲﴾

یہاں پرویز صاحب نے جس سہ نکاتی فارمولے کو پیش کیا ہے اس پر سب سے پہلا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں جتنے بھی مفسرین وفقہاء گذرے ہیں کیا ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے جو عربی لغت سے جاہل ہو یا قرآن کی اصطلاحات سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر ہو؟ اور اگر کوئی ہے تو پرویز صاحب نے اپنی کسی کتاب میں بھی کسی مقام پر اس کی نشان دہی کیوں نہیں فرمائی تاکہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں مفسر نے قرآن کی فلاں اصطلاح کا مفہوم غلط سمجھا، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پرویز صاحب کو کیسے معلوم ہوا کہ لغت کی فلاں فلاں کتاب مستند ہے لہذا اس سے استفادہ کرنا چاہیے یعنی اگر احادیث کی تمام کتابیں اس لئے ظنی ہیں کہ وہ انسانوں نے لکھی ہیں تو لغت کی کتابوں کے یقینی طور پر صحیح ہونے کی کیا دلیل ہے وہ بھی تو آخر انسانوں نے ہی لکھی ہیں مذید برآں لغت کی جتنی بھی کتابیں ہیں وہ سب نزول قرآن کے بعد کسی زمانے میں لکھی گئی ہیں اور ان کو لکھنے والے بھی اکثر و بیشتر عربی النسل نہیں بلکہ عجمی ہیں حالانکہ پرویز صاحب کے نزدیک محدثین کی روایات قبول کرنے میں سب سے زیادہ مانع ان میں سے اکثر کا عجمی ہونا ہی ہے اسکے باوجود احادیث سے بغض اور لغت پر اتنی مہربانی، آخر کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے، تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر پرویز صاحب کے ہاتھ کوئی مستند لغت لگی تھی جسکی مدد سے انھوں نے خود قرآن سمجھا تو دوسروں کو سمجھانے کے لئے انھوں نے خود لغات القرآن تصنیف کرنے کی زحمت کیوں فرمائی اس مذکورہ لغت کا اردو ترجمہ ہی

شائع کیوں نہیں کر دیا جوان کے پاس موجود تھی درحقیقت اصل بات یہ ہے کہ پرویز صاحب نے مختلف لغات کی مدد سے قرآن کی بعض اصطلاحات اور الفاظ کے دوراز کار معنی تلاش کیئے اور پھر انھیں مستند قرار دیکر خود اپنی لغات القرآن مرتب کر ڈالی لیکن پھر مفہوم القرآن میں اس لغات القرآن کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا اور قرآنی آیات کا وہ مفہوم بیان کیا گیا جو پرویز صاحب کی ذاتی ذہنی اختراع کا نتیجہ تھا اس اعتبار سے پرویز صاحب کو منکر حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ محرف قرآن کا بھی اعزاز حاصل ہے اور پرویز صاحب نے اسی فہم قرآن کی روشنی میں مسئلہ تقدیر کو بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جس مسئلہ کی بنیادی اینٹ ہی غلط رکھی گئی ہو اس مسئلہ کا کیا حل نکلے گا اور وہ حل کتنا شاندار ہوگا اسکا اندازہ اہل عقل و دانش بخوبی لگا سکتے ہیں۔

پرویز صاحب کی سوچ نے جس دور میں پرواز کرنا سیکھا وہ دور کمیونزم یا اشتراکیت کے عروج کا دور تھا جس کے ان کی سوچ پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے یہاں تک کہ جب انھوں نے کمیونزم کی عینک سے قرآن کا مطالعہ کیا تو انہیں قرآن میں بھی کمیونزم ہی نظر آیا جسکا نام پرویز صاحب نے قرآن کا نظام ربوبیت رکھا لیکن اس نظام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں میں مروج مسئلہ تقدیر تھا جس کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کے رزق کو چاہا تنگ کر دیا اور جس کے رزق کو چاہا فراخ کر دیا ہے جبکہ کمیونزم کے اندر سارا مال حکومت کا ہے اور حکومت اس مال کو عوام الناس میں بنیادی ضرورتوں کے مدنظر برابر تقسیم کرے گی چنانچہ اسی مسئلہ کو حل کرنے اور اپنے ایجاد کردہ نظام ربوبیت کو ثابت کرنے کے لئے پرویز صاحب کو مسئلہ تقدیر پر باقاعدہ علیحدہ سے کتاب لکھنے کی ضرورت پڑی جس میں پرویز صاحب ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور مروجہ سائنسی قوانین کو حرف آخر گردانتے ہوئے قرآنی آیات کی جی بھر کے تحریف اور دینی اصطلاحات کی خاطر خواہ مرمت کرنے کے بعد بالآخر جس نتیجہ پر پہنچے کہ:

﴿قرآنی تصور کا خدا اپنی لاانتہاء قوتوں کے باوجود، قاعدے قانون والا خدا ہے، اس لئے اسے ماننے والی قوم دنیا میں انتہائی درجہ کی قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے والی قوم ہوگی، یہی تقدیر کا عملی مفہوم ہے یعنی اپنے اختیار و ارادہ سے قوانین خداوندی کی اطاعت☆ کتاب التقدیر صفحہ آخر﴾

پرویز صاحب کے نزدیک یہ تقدیر کا عملی مفہوم ہے جبکہ تقدیر کے نظری مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھدی گئی ہے کہ وہ ان قوانین کو دریافت کر سکے سائنس کی اصطلاح میں ان قوانین کو،قوانین فطرت کہتے ہیں لیکن قرآن کی اصطلاح میں انہیں مشیت خداوندی کہہ کر پکارا جائیگا اوران اشیاء کاان قوانین کے تابع چلنا ان کی تقدیر کہلائے گا☆ کتاب التقدیر ص۳۹۴﴾

یعنی پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق تقدیر کے پابند صرف حیوانات،نباتات اور جمادات ہیں جبکہ انسان صرف قوانین فطرت کا پابند ہے اور کائنات میں پائی جانے والی فطری قوتوں پر قابو پا کر جب چاہے اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔

مسئلہ تقدیر درحقیقت اتنا مشکل نہیں جتنا اسے بنادیا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مسئلہ کو جب بھی فلسفہ،منطق یا سائنس کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی یا کیجائے گی یہ مذید الجھ جائے گا اور نتیجہ کے طور پر انسان یا تو مجبور محض قرار پائے گا جیسا کہ جبریہ فرقہ نے باور کیا تھا یا مکمل طور پر آزاد جیسا کہ پرویز صاحب نے سمجھا ہے حالانکہ انسان نہ مکمل طور پر آزاد وخود مختار ہے اور نہ ہی مجبور وبے بس ہے بلکہ اصل صورت حال ان دونوں کے بین بین ہے دراصل انسان کے ایمان اور عمل کی مثال ایک ایسی کمپنی کی ہے جس میں ایک سے زائد لوگ شریک ہوتے ہیں اور جس کے منافع میں ہر شریک اپنے حصے کے مطابق حق دار ہوتا ہے یعنی انسان کا کوئی بھی عمل خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا،اچھا ہو یا برا اور خیر ہو یا شر اسکا ذمہ دار صرف انسان نہیں بلکہ اگر یہ عمل اچھا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تائید وتوفیق اور ہدایت کے باعث سرانجام پایا ہے اور برا عمل چونکہ شیطان کے اکسانے کے سبب ہوتا ہے اور شیطان کو پیدا کرنے اور انسانوں کے گمراہ کرنے کی قوت چونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو دی ہے اس لئے برے عمل کا ذمہ دار بھی انسان اکیلا نہیں ہے اسی اعتبار سے قرآن کریم میں اچھے عمل کی نسبت کہیں اللہ کی تعالیٰ کی طرف ہے تو کہیں خود انسان کی طرف جبکہ برے عمل کی نسبت کہیں شیطان کی طرف ہے،کہیں انسان کی طرف اور تقدیر کے مسئلہ کو حل کرنے کے ضمن

میں اکثر لوگوں کے سامنے یہی افعال کی بدلتی ہوئی نسبت ہمیشہ عقدہ لانیحل بن سامنے کر کھڑی ہو جاتی ہے جسے حل کرنے کے لئے کبھی کوئی گروہ منطق وفلسفہ کا سہارا لیتا ہے تو کوئی فریق کوئی تاویلات کا سہارا تلاش کرتا ہے جسکے باعث یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ جاتا ہے حالانکہ کسی فعل کے ایک سے زائد فاعل ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے ہماری روزمرہ کی زندگی میں اسکی کئی مثالیں مل سکتی ہیں مثلاً تاج محل جوفن تعمیر کا ایک شاہکار ہے اور جس کا شمار عجائبات عالم میں کیا جاتا ہے کہ اگر اسکے بارے میں یہ کہا جائے کہ اسے مغل بادشاہ شاہجہاں نے تعمیر کیا تو یہ بیان صحیح ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ تاج محل اس زمانے کے کسی ماہر تعمیرات کا کمال ہے تو یہ بھی صحیح ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ اسے مزدوروں نے تعمیر کیا تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا یعنی ایک ہی فعل کے ایک سے زائد فاعل ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوتی اور یہی اسلوب قرآن میں اختیار کیا گیا ہے مثال کے طور پر سورۃ آل عمرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ واماالذین امنو وعملوا الصالحات فیوفیھم اجور ھم واللہ لایحب الظالمین ☆۵۷﴾

یعنی ''جو لوگ بھی ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے انھیں ان کا پورا اجر دیا جائے گا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا'' یہاں انسان کے ایمان اور اچھے عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے جبکہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ فمالکم فی المنافقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ومن یضلل للہ فلن تجد لہ سبیلا ☆۸۸﴾

یعنی ''کیا ہوا ہے تم لوگوں کو کہ منافقین کے بارے میں مختلف الآراء ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان کو انکے کرتوتوں کے سبب گمراہی میں لوٹا دیا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ اسے ہدایت دو جسے اللہ نے گمراہ قرار دیا ہے اور جسے اللہ گمراہ قرار دے پھر اسکے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا'' یہاں منافقین کے عمل کی نسبت منافقین کی طرف اور گمراہ قرار دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اس قسم کی آیات کی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے کہ انسان کے ہر عمل کو کسب کے اعتبار سے انسان کا عمل کہا جاتا ہے اور تخلیق کے اعتبار سے اسکی نسبت

اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اس قسم کی آیات میں دونوں بدعتی عقیدوں یعنی جبریہ اور قدریہ کا رد ہے جیسا کہ سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے ''ایاک نعبدوایاک نستعین'' میں عبادت کے عمل کی نسبت انسان کی طرف اور استعانت اللہ سے طلب کی گئی ہے نیز اس مسئلہ کی اصل اور بنیاد اس آیت میں ہے کہ:

﴿ واللہ خلقکم وماتعملون☆سورۃ الصافات ٩٦ ﴾

یعنی ''اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا ہے'' البتہ انسان کے برے عمل کی نسبت کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی گئی اور نہ ہی کرنی چاہیے لیکن بعض مقامات پر انسانوں کے اچھے عمل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب کی ہے مثلاً سورۃ الانفال میں فرمایا:

﴿ فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی ولیبلی المؤمنین منہ بلاء حسنا ان اللہ سمیع علیم☆١٧ ﴾

یعنی ''غزوہ بدر کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ان کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا اور اے نبی تم نے جو مٹھی بھر کے پھینکی تھی وہ تم نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین کی اچھی آزمائش کرے، بے شک اللہ سننے اور جاننے والا ہے'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مٹی پھینکنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور نبی کریم ﷺ سے اس کی نفی کی ہے پھر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ جب وہ مٹی آپ نے پھینکی تھی اس پر علماء نے کہا ہے کہ اس میں ایک عمل کا اثبات یعنی مٹی کا پھینکنے کا اثبات ہے اور ایک عمل کی نفی ہے یعنی اس مٹی کا موثر ہونا نبی ﷺ کے عمل سے نہیں تھا بلکہ یہ اللہ کا عمل تھا کہ اور سورۃ الصافات کی درجہ بالا آیت کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل نبی کریم ﷺ کا تھا مگر اس عمل کا خالق اللہ تعالیٰ تھا اس اعتبار سے یہ عمل حقیقی طور سے اللہ کا ہوا اسلئے اس عمل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی اور بعض مقامات پر کفر اور ایمان کو انسان کا اختیار قرار دیا گیا ہے مثلاً سورہ الکہف میں ارشاد ہوا:

﴿ وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر ☆٢٩ ﴾

یعنی ''کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر میں مبتلا رہے'' جبکہ سورۃ النحل میں ہدایت وگمراہی کو اللہ تعالیٰ کی منشاء قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ ولو شاء الله لجعلكم امة واحدة ولكن يضل من يشاء ويهدى من يشاء ولتسالن عما كنتم تعملون ☆۹۳﴾

یعنی ”اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے محروم کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تم سے اس بارے میں ضرور پوچھا جائے گا جو کچھ بھی تم کرتے ہو“ اسی طرح کسی کسی مقام پر انسان کے عمل کو شیطان کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے مثلاً سورۃ یوسف میں یوسف علیہ السلام سورۃ کے آخر میں اپنے بھائیوں کی طرف سے کی جانے والی سازش کو شیطان کی طرف نسبت کرتے ہوئے اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿ وقد احسن بى اذ اخرجنى من السجن وجاء بكم من البدو من بعد ان نزع الشيطان بينى وبين اخوتى☆۱۰۰ ﴾

یعنی ”مجھ پر میرے رب نے بہت احسان کیا کہ مجھے جیل سے نجات دی اور آپ سب اہل خانہ کو صحراء سے لاکر مجھ سے ملا دیا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان عداوت ڈال چکا تھا“ لیکن اس سب کے باوجود ہر انسان ہدایت واعمال صالح یا گمراہی وبرے اعمال کا ذمہ دار خود ہے کیونکہ سورۃ فصلت میں قوم ثمود کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

﴿ واما ثمود فهدينا هم فاستحبوا العمى على الهدى فاخذتهم صاعقة العذاب الهون بما كانوا يكسبون☆۱۷ ﴾

یعنی ”قوم ثمود کو ہم نے ہدایت دی لیکن انہوں نے ہدایت سے اندھا رہنا پسند کیا پھر جو کچھ وہ کرتے تھے اسکے سبب چنگھاڑ کے رسوا کن عذاب نے انہیں پکڑ لیا“ پس اس ضمن میں سب سے بہتر روش یہ ہے کہ انسان اپنے اچھے عمل کی نسبت اپنی جانب کرنے کے بجائے اللہ کی طرف کرے کیونکہ اسی چیز کو قرآن نے مومنین اور جنتی لوگوں کو شیوا بتایا ہے جبکہ اپنے غلط عمل کی نسبت شیطان، یا اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے بجائے انسان خود اپنی طرف کرے اور کسی دوسرے کے غلط عمل کی نسبت شیطان کی طرف کرے جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے کیا، ایسا کرنے سے انسان کے اندر تکبر کی جگہ عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے جو دنیا وآخرت

میں انسان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

مسئلہ تقدیر کو سمجھنے کے لئے دوسری چیز جس کی بے حد ضرورت ہے وہ اس ضمن میں وارد احادیث کا گہرا مطالعہ ہے جس کی توفیق سے پرویز صاحب اور انکے متبعین قطعی طور پر محروم ہیں یہ حضرات اولاً تو احادیث کو وحی سے خارج باور کرنے کے باعث قابل التفات سمجھتے ہی نہیں اور ثانیاً اگر کبھی احادیث پڑھیں بھی تو اسی مقصد سے پڑھتے ہیں کہ کوئی حدیث ایسی مل جائے جو بظاہر قرآن کے کسی بیان سے مختلف نظر آتی ہو تو اسے لے اڑیں اور اس پر خوب خوب حاشیہ چڑھائیں حالانکہ ہم سطور بالا میں دیکھ چکے ہیں کہ ایمان اور اعمال کے ضمن میں جو آیات وارد ہیں ان میں بظاہر کتنا اختلاف ہے اور اختلاف کو دور کرنے اور باہم تطبیق کرنے کے لئے پرویز صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ انہوں نے انسان کو اسکے اچھے یا برے عمل کا ذمہ دار قرار دیئے جانے والی آیات کو اصل قرار دیا ہے اور دوسرے قسم کی آیات کی کوئی نہ کوئی تاویل کی ہے اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی کوئی تقدیر نہیں یا انسان کی تقدیر خود اسکے اپنے ہاتھوں میں ہے اور ہدایت و گمراہی حاصل کرنے میں بھی وہ مکمل طور پر خود مختار ہے لیکن انہی منکرین حدیث کو اس قسم کا کوئی اختلاف یا اس سے کہیں کم تر درجہ کا اختلاف بھی اگر احادیث میں مل جاتا ہے تو وہ اسے بے پر کا کوا بنا کر خوب اڑاتے ہیں حالانکہ یہی حضرات جب قرآن کی آیات میں تطبیق کرنے بیٹھتے ہیں تو اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی وہ تطبیق اکثر و بیشتر غلط ہی ہوتی ہے کیونکہ ان کا مقصد آیات کے ظاہری اختلاف کو فرو کرنا نہیں بلکہ اپنے باطن میں چھپے ہوئے کچھ خاص نظریات کی کو قرآن کی سند عطاء کرنا پیش نظر ہوتا ہے مثال کے طور پر سورۃ النحل کی جو آیت ہم نے سطور بالا میں نقل کی ہے جس کے مطابق ”اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت سے محروم کرتا ہے“ کا مفہوم پرویز صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں کہ:

﴿ تمہارے دل میں بار بار یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر اللہ کو ایسا ہی منظور تھا تو اس نے تمام انسانوں کو ایک جیسا کیوں نہ بنا دیا اور سب کو ایک ہی راستہ پر کیوں نہ چلا دیا، یہ ٹھیک ہے کہ اگر وہ چاہتا تو اپنے قانون کائنات کے مطابق تم سب کو ایک جیسا بنا دیتا لیکن اس نے

ایسا نہیں کیا اس نے تمہیں صحیح راستہ دکھادیا، اور اس کا فیصلہ تم پر چھوڑ دیا کہ چاہے اسے اختیار کرلو اور چاہے اسے چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلو اور یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ تم اپنے ہر عمل کے ذمہ دار ٹھہرو☆ مفہوم القرآن ص ٦١٧﴾

پرویز صاحب نے یہاں لفظ ''من یشاء'' کا معنی ''تم چاہو تو'' کیا ہے حالانکہ یہ قرآن کی سراسر تحریف ہے بلکہ اسکا صحیح معنی ہے ''اگر وہ چاہتا'' یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت سے محروم قرار دے کر گمراہی کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے یعنی یہاں لفظ ''یضل'' اور ''یھدی'' کا فاعل انسان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے جبکہ پرویز صاحب نے انسان کو ان افعال کا فاعل قرار دیتے ہوئے ترجمہ کیا ہے قرآن کی یہ ایسی کھلی تحریف ہے جس سے یہود نصاریٰ بھی شرما جائیں یہاں یہ صرف ایک مثال ہے پرویز صاحب کے مفہوم القرآن میں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملیں گی اس لئے پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کو اگر مفہوم القرآن کے بجائے پرویز صاحب کی شاطر دماغی کا ثبوت کہا جائے تو قطعی طور پر درست ہوگا جیسا کہ پرویز صاحب ابن عربی الصوفی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

﴿اس میں شبہ نہیں کہ ابن عربی بڑے ذہین اور فطین تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کسی ذہین اور فطین کی گردن ٹیڑھی ہو جائے تو جس قدر نقصان وہ پہنچا سکتا ہے دوسروں کے یہاں اسکی مثال نہیں ملتی ابن عربی کی ذہانت نے بھی یہی کچھ اسلام کے ساتھ کیا ☆ تصوف کی حقیقت ص ٨٠﴾

کم وبیش یہی کچھ پرویز صاحب کی ذہانت نے بھی اسلام کے ساتھ کیا ہے یعنی لغت کے ساتھ کھیل کر عربی زبان سے نابلد اور انگریزی زبان کے واقف مغرب زدہ مرعوب ذہنوں کو خوب خوب بے وقوف بنایا ہے لیکن پرویز صاحب کی تمام شعبدہ بازیوں کی قلعی کھولنا اس کتاب کا موضوع نہیں ہے چنانچہ سردست زیر نظر تالیف کے تحت مسئلہ تقدیر کے ضمن میں پرویز صاحب کی جانب سے پیش کئے گئے تمام دلائل کا جواب قرآن وحدیث اور اجماع امت کے حوالے سے دیا جارہا ہے اور اس ضمن میں ان اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے

جن سے صرف نظر کرنے کے باعث پرویز صاحب نے مسئلہ تقدیر کا عملی طور پر انکار کرتے ہوئے لفظ تقدیر کو محض ایک اصطلاح قرار دینے کی سعی فرمائی ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ:

﴿عربی زبان کے قاعدے کی رو سے تقدیر کے معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ عطاء کرنا اور خدا کی تقدیر کے معنی ہوں گے خدا کی طرف سے مقرر کردہ پیمانے یا قوانین خداوندی اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تقدیر کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ہمارے یہاں یہ لفظ کن معانی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی قرآن کریم کی رو سے تقدیر خدا کی ہے انسان کی تقدیر کہنا ہی غلط ہے ☆ کتاب التقدیر ص۴۲﴾

جیسا کہ پرویز صاحب نے فرمایا کہ تقدیر کے معنی پیمانہ ہے تو ظاہر ہے کہ پیمانہ خالق کی طرف سے مخلوق کے لئے ہوگا مثال کے طور پر کسی دکاندار مثلاً کپڑے والے کے پاس کوئی پیمانہ ہے تو وہ کپڑا ناپنے کے ہے اس لئے جب کوئی شخص کپڑا خریدتا ہے تو اسکی نسبت اس میٹر کی طرف کرتا ہے جو دکاندار کے پاس ہے اور اس اعتبار سے اس کپڑے کو ایک میٹر یا دو میٹر کہتا ہے اسی طرح کائنات کا پیمانہ یا تقدیر کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مگر یہ تقدیر مخلوق کی ہے اس لئے تقدیر کی نسبت کائنات اور اسمیں موجود تمام اشیاء کی طرف کی جاتی ہے جسمیں انسان بھی شامل ہے پس تقدیر کی نسبت انسان کی طرف کرنے کو غلط کہنا ایسی ہی جہالت ہے جیسے کوئی شخص کپڑے کی نسبت میٹر کی طرف کرنے کو غلط کہتا ہو نیز بسا اوقات ایک لفظ جب مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اسکے معنی کچھ ہوتے ہیں اور جب خالق کے لئے استعمال ہو تو معنی کچھ اور ہوتے ہیں مثلاً توّاب کا لفظ اللہ تعالیٰ لئے استعمال ہوتا ہے اور انسان کیلئے بھی ہوتا ہے لیکن جب یہ لفظ انسان کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بہت زیادہ توبہ کرنیوالا لیکن یہی لفظ جب اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہو تو اسکے معنی ہوتے ہیں توبہ کو قبول کرنے والا اسی طرح تقدیر کا لفظ بھی جب خالق کے لئے استعمال ہوگا تو اسکے معنی ہوں گے پیمانے سے بنانیوالا اور جب یہی لفظ مخلوق کے لئے استعمال ہوگا تو اسکے معنی ہوں گے پیمانے سے بنا ہوا یعنی کائنات میں ہر شئے بشمول انسان اللہ تعالیٰ کے علم کامل کے تحت ایک خاص پیمانے پر تخلیق ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں اسکا جو انجام ازل سے طے شدہ ہے اسی کے عین مطابق اپنے انجام

کو پہنچتی ہے اسی کو اشیاء کائنات یعنی نباتات، جمادات، حیوانات، انسان اور دیگر تمام موجودات کی تقدیر کہتے ہیں نیز یہاں پرویز صاحب نے لفظ ''تقدیر'' کا معنی کیا ہے ''قوانین خداوندی، اندازہ، پیمانہ'' ہم کہتے ہیں کہ اگر تقدیر کے انہیں معنوں کو صحیح مان لیا جائے جو پرویز صاحب نے بیان کئے ہیں تب بھی مسئلہ تقدیر کے ضمن میں پرویز صاحب کا مسلک زمیں بوس ہوجاتا ہے کیونکہ تقدیر کے پرویزی معنی تسلیم کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان اپنے لئے قوانین خداوندی خود بنا سکتا ہے یا خدا کا اندازہ یا پیمانہ وضع کرسکتا ہے؟ اگر پرویز صاحب کا جواب ہاں میں ہے تو وہ اعلانیہ طور پر کفر کے مرتکب ہوتے ہیں کیونکہ جو پیمانہ یا قانون خدا کا ہے وہ خدا ہی بنا سکتا ہے اس اعتبار سے پرویز صاحب خدائی کے دعویدار ہوئے، اور اگر پرویز صاحب کا جواب انکار میں ہے تو تقدیر یعنی قانون اور پیمانہ کی تخلیق کو اللہ تعالیٰ کا فعل مان کر تقدیر کا فاعل اللہ تعالیٰ کو مان لیتے ہیں اور تقدیر کا مفعول اشیاء کائنات قرار پاتی ہیں اس طرح مسئلہ تقدیر ثابت ہوجاتا ہے اور تمام اختلاف اور جھگڑا از خود ختم ہوجاتا ہے۔

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں پرویز صاحب نے اپنی شاطرانہ چالوں اور قرآنی آیات کی شرح میں تحریف کے ذریعہ لفظ تقدیر کو محض ایک اصطلاح باور کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور عملی میدان میں مسئلہ تقدیر کے تحت وارد احادیث کو مشکوک اور غلط قرار دیتے ہوئے مسئلہ تقدیر کا کلی طور پر انکار کیا ہے چنانچہ ہم نے موجودہ دور میں فتنہ انکار حدیث کو لگام دینے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس اہم مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس مسئلہ کے ضمن میں حق اور صحیح بات لکھنے اور قارئین کرام کو حق سمجھنے اور قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆ وصلی اللہ علی نبینا محمد و علی آلہ واصحابہ وسلم ☆

والسلام

ابوالوفاء محمد طارق عادل خان

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ ہجری

دین اور مذہب کا فرق:

مسئلہ تقدیر کو حل کرنے سے قبل پرویز صاحب نے اپنی کتاب میں کچھ بنیادی اسلامی اصطلاحات کی تعریف وتشریح بیان فرمائی ہے ان میں سے ایک دین اور مذہب کا فرق بھی ہے اسکے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

﴿جو نظام حیات خدا کی طرف سے بذریعہ وحی حضرات انبیاء کرام کو ملتا تھا اسے دین کہا جاتا ہے لیکن بعد میں جب اس دین میں انسانی تحریفات راہ پالیں تو دین نہیں رہتا مذہب بن جاتا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۲۷﴾

دین اور مذہب میں واضح کردہ اس فرق کو پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرویز صاحب یہاں دین اور مذہب کے فرق کو نہیں بلکہ قرآن اور اپنے مفہوم القرآن کے فرق کو بیان فرمارہے ہیں کہ ''جبرائیل کے واسطہ سے جو وحی نبی کریم ﷺ کو ملی وہ قرآن تھی لیکن جب پرویزی تحریفات نے اس میں راہ پالی تو وہ مفہوم القرآن بن گئی'' بہرکیف دین اور مذہب کے درمیان یہ فرق پرویز صاحب کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ مذہب کی تعریف اہل علم نے اسطرح کی ہے کہ:

﴿طریقة معینة فی استنباط الأحکام الشرعیة من أدلتها التفصیلیة﴾

یعنی ''شرعی احکامات کے استنباط کا ایک معین طریقہ جو تفصیل پر دلالت کرے'' ہر نماز کے اندر ہم اللہ تعالیٰ سے سورۃ فاتحہ کے دوران دعا مانگتے ہیں کہ ''ہم کو ان لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تو نے انعام کیا'' ان انعام یافتہ لوگوں کا راستہ کیا ہے اور یہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں اسکی وضاحت خود قرآن کرتا ہے کہ:

﴿ومن یطع الله والرسول فأولئک مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین وحسن أولئک رفیقا ☆ سورة النساء ۶۹﴾

یعنی ''جو لوگ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین اور ان لوگوں کی رفاقت خوب ہے''

اس آیت میں یہ بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ کا راستہ ہے جس میں بعد میں ان منعم علیہ لوگوں کا اجتہاد اور اجماع بھی شامل ہوجاتا ہے تو اسی کو مذہب کہتے ہیں، عجیب بات ہے کہ پرویز صاحب ایک جانب قرآن کے علاوہ کسی چیز کو وحی تسلیم نہیں کرتے اور دوسری جانب یہ کہہ رہے ہیں کہ جو نظام حیات بذریعہ وحی انبیاء کرام کو ملتا تھا اسے دین کہتے ہیں اسکا مطلب یہ ہوا کہ دین قرآن ہی کا دوسرا نام ہے اور پرویز صاحب قرآن میں تحریف کے قائل نہیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر دین میں تحریف کیسے واقع ہوگئی اور دین مذہب کیسے بن گیا پھر دوسری جانب پرویز صاحب مذہب کو دین سے قبل کی ایجاد بھی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب اس وقت پیدا ہوا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دین نازل ہی نہیں ہوا تھا چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

﴿مذہب انسان کے عہد طفولیت میں پیدا شدہ تصورات کا مجموعہ ہے جب وہ بچے کی طرح ہنوز قانون کے تصور سے ناآشنا تھا، انسان اب بالغ ہوچکا ہے اور عقل وفکر کی رو سے خدا کے اس تصور کو سراہ سکتا ہے جو اسے دین نے عطاء کیا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۴۹﴾

معلوم ہونا چاہیے کہ پرویز صاحب ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے قائل تھے اور یہاں انسان کے عہد طفولیت سے پرویز صاحب کی مراد وہ دور ہے جب انسان بندر سے نیا نیا انسان بنا تھا اپنے اسی نظریہ کی بنیاد پر وہ قرآن کریم میں سات مرتبہ وارد آدم اور ابلیس کے قصے سے کلی طور پر انکار کرتے ہیں اور معاذ اللہ اسے ایک جھوٹا قصہ گردانتے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض ہماری وعظ اور نصیحت کے واسطہ قرآن میں متعدد مرتبہ بیان کیا، پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿قرآن کریم کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسمیں آدم سے متعلق جو قصہ بیان ہوا ہے وہ کسی ایک فرد یا کسی جوڑے، میاں بیوی کی داستان نہیں، وہ خود آدمی کی سرگزشت ہے جسے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے، قدیم انسان کی ابتدائی زندگی بڑے امن اور فراوانی کی زندگی تھی، جب اس نے مل جل کر رہنے کی تمدنی زندگی شروع کی تو ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ پیدا ہوا اس ٹکراؤ کا نتیجہ فساد تھا اسے دور کرنے کے لئے خدا کی طرف سے وحی

کا سلسلہ شروع ہوا، جب اس نے اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کی اسکا معاشرہ جنت بداماں ہوگیا اور جب اس نے وہ راستہ چھوڑ دیا پھر جہنمی زندگی شروع ہوگئی یہی داستان آدم وابلیس ہے☆ تبویب القرآن ص۲۴﴾

اس مندرجہ بالا پیرا گراف سے پرویز صاحب کے اکثر باطل عقیدے صاف ظاہر ہیں مثلاً آدم علیہ السلام کو پیغمبر اور ایک خاص انسان تسلیم کرنے سے صاف انکار، اپنا اور تمام بنی نوع انسان کا نسب آدم علیہ السلام سے منقطع کر کے معلق چھوڑ نا جس کا لازمی نتیجہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر پرویز صاحب اور انکے متبعین کے ایمان کی صورت میں ظاہر ہونا، انسان کے باہمی ٹکراوء کی منطق کے ذریعہ شیطان کے وجود کا مطلق انکار اور جنت اور جہنم کے وجود کو محض ایک اصطلاح قرار دے کر جنت اور جہنم کے اصل وجود کو اپنے متبعین کی سوچ اور ذہن سے خارج کرنا، پرویز صاحب انسان کے ابتدائی دور کو عہد طفولیت سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ قرآن یہ کہتا ہے انسان کا آغاز مکمل علم اور شعور کے ساتھ ہوا چناچہ سورہ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وعلم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم على الملائكة فقال انبئونی بأسماء هولاء ان كنتم صادقين☆ سورة البقرة ۳۱﴾

یعنی ’’آدم علیہ السلام کو پورا علم الاسماء دیا گیا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا اور فرشتوں سے کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو اس علم کا مقابلہ کر کے دکھاؤ‘‘ اور قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس وقت موجود تمام مخلوق یہاں تک کہ جنات اور فرشتوں نے بھی آدم کو سجدہ کیا سوائے ابلیس ملعون کے جس نے انکار کیا لیکن اسکے برخلاف پرویز صاحب آدم کو ایک ایسا انسان یا نوع انسان قرار دیتے ہیں جو دنیا کی ہر طاقت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کرتے ہوئے ہر در پر سجدہ کر رہا تھا چناچہ پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿ابتدائی دور کے انسان نے ان مہیب قوتوں کی ہولناک تباہی سے بچنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا کہ علی الصبح افق مشرق پر آتشیں گولہ نمودار ہوا تو وہ اسکے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا، آسمان سے بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور رعد کی کڑک روح فرسا ہوئی تو یہ ان کے سامنے سجدے میں گر گیا، اس نے کبھی شیر کو دیوتا بنایا اور کبھی سانپ کو اور کہیں اگنی

کی پوجا کرنے لگ گیا ☆ کتاب التقدیر ص ۳۱﴾

یہاں پرویز صاحب لادینیت کو مذہب قرار دے رہے ہیں اور اس سے قبل والی عبارت میں محرف شدہ دین کو مذہب قرار دے رہے تھے لیکن عجیب بات ہے کہ یہی پرویز صاحب جب دین اور مذہب کی تعریف لغت کے اعتبار سے کرتے ہیں تو وہاں اس قسم کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا جیسا کہ دین کی تعریف کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿''دین'' یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے ازانجملہ ،غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، ٹھوس نتیجہ، جزاوسزا، بدلہ ہیں دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرمانبرداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، صاحب لطائف اللغہ نے بھی اسکے معنی حساب، غلبہ، تدبیر اور عادت کے لکھے ہیں، قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معنی میں استعمال ہوا ہے ☆ لغات القرآن ص ۶۸۱﴾

اور مذہب کی تعریف کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿''المذہب'' جانا، جانے کی جگہ، راستہ، طریقہ یا وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ہو مذہب کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا اس لئے اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہیے دین ہی کہنا چاہیے درحقیقت مذہب کے معنی مکتب فکر کے ہیں، ابتدائے اسلام میں صرف دین تھا بعد میں جب مختلف ائمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ہوئے تو دین کی جگہ مذہب نے لے لی چناچہ ''ذہب فی الدین مذہبا'' کے معنی ہیں اس نے دین کے بارے میں فلاں عقیدہ اختیار کیا اور ''فلان یذہب الی قول ابی حنیفۃ'' کے معنی ہیں فلاں شخص امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق چلتا ہے ☆ لغات القرآن ص ۷۰۵﴾

اب اگر پرویز صاحب کی تعریف کے مطابق دین کے معنی آئین، قانون یا حکومت لیا جائے تو مذہب کا مطلب ہوا اس آئین، قانون یا حکومت کو عملی طور پر نافذ کرنے کا طریقہ اور اگر دین کے معنی اطاعت اور فرمابرداری ہیں تو مذہب کا معنی اطاعت اور فرمابرداری کے لئے متعین کردہ راستے پر چلنا ہوا یعنی دین کو عملی

طور پر نافذ کرنے کا طریقہ مذہب کہلائے گا جو اپنی ذات میں صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی لیکن مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ پرویز صاحب ایک جانب مذہب کو مطعون کرتے ہیں اور دوسری جانب خود اپنا تعلق بھی ایک مذہب ہی سے جوڑتے ہیں چناچہ ایک سائل کے خط کا جواب دیتے ہوئے پرویز صاحب نے اپنے حنفی المذہب ہونے کی صراحت ان الفاظ میں فرمائی ہے، لکھتے ہیں کہ:

﴿اگر آپ میرے پاس ہوتے تو از خود دیکھ لیتے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں لیکن چونکہ آپ یہاں سے دور ہیں اسلئے آپ کو لکھ کر پوچھنے کی ضرورت پڑ گئی ، میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مسلمان فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھتے ہیں☆ قرآنی فیصلے جلد اول ص ۱۶﴾

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرویز صاحب خود حنفی المذہب ہونے اور عربی لغت سے دین اور مذہب میں کوئی باہم منازعت ثابت نہ کر سکنے کے باوجود آخر کیوں لفظ مذہب پر اتنا برہم ہیں اسکا جواب یہ ہے دراصل پرویز صاحب کو اپنے خود ساختہ نظریہ تقدیر، نظام ربوبیت اور مرکز ملت وغیرہ جیسے من گھڑت عقائد کے لئے حدیث یا تاریخ اسلام میں کہیں کوئی جائے پناہ نہیں ملتی اسلئے انھوں نے اپنے متبعین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت یہ سب چیزیں دین میں موجود تھیں مگر مذاہب نے ان کو چھپا دیا ہے یا بدل ڈالا ہے اس لئے جب تک مذاہب کو ختم نہ کیا جائے یعنی تابعین اور محدثین سے لیکر آج تک کے تمام اہل علم کے سرمائے علم وفقہ کو دریا برد نہ کر دیا جائے دین اجاگر نہیں ہو سکتا کیونکہ پرویز صاحب کی نظر میں دین وہ ہے جو پرویز صاحب یا ان کے معتزلہ اسلاف نے سمجھا نیز اگر پرویز صاحب کے بقول مذہب کا لفظ قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوا اس لئے اسلام کو مذہب کہنا غلط ہے تو قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ''خدا'' کا لفظ بھی کہیں استعمال نہیں ہوا پھر کیوں پرویز صاحب اللہ تعالیٰ کے بجائے ہر جگہ ''خدا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح طلوع اسلام کی بعض دیگر اصطلاحات بھی قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوئیں ایسی صورت میں انکے اسلامی ہونے کی پرویز صاحب کے پاس کیا دلیل ہے۔

خلق اور امر کی بحث:

خلق اور امر کی وضاحت کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿قرآن کریم نے خدا کی دو دنیاؤں کا ذکر کیا ہے ایک کا نام عالم امر ہے جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماوراء ہے اور دوسرا ہے عالم خلق جو خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۳۵﴾

دو دنیاؤں یعنی عالم خلق اور عالم امر کا عقیدہ تصوف کی پیداوار ہے جو غالباً پرویز صاحب نے صوفیاء سے ہی اخذ کیا ہے کیونکہ پرویز صاحب اپنی عمر کا ایک طویل حصہ تصوف میں گزار آئے تھے جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' میں کیا ہے اور معلوم ہونا چاہیے کہ عقیدہ وحدۃ الوجود اسی عالم خلق اور عالم امر کے فرق کا ایک منطقی نتیجہ ہے جو ہر صوفی کا عقیدہ ہے اور اسی فرق کے قائل ہونے کے باعث پرویز صاحب بھی انہی صوفی حضرات کے ہم مشرب قرار پاتے ہیں عقیدہ وحدۃ الوجود یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی دوسری چیز موجود ہی نہیں ہے اور اس کائنات میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی شکل ہے کیونکہ صوفیاء کے نزدیک روح کا تعلق عالم امر سے ہے اور صوفیاء کے قول کے مطابق انسان کے اندر جو روح ہے وہ اللہ کی روح ہے جبکہ جسم کا تعلق عالم خلق سے ہے اسکے نتیجہ میں انسان کا ہر فعل خواہ وہ اچھا ہو یا برا اللہ کا فعل بن جاتا ہے پس اس اعتبار سے عالم خلق اور عالم امر کے فرق کا عقیدہ باطل ہے اور صوفیاء کی اپنی ذہنی اختراع سے زیادہ کچھ نہیں البتہ پرویز صاحب کا اس نظریہ کا قائل ہونا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا کہ ''انسان اپنے ہر عمل میں خود مختار ہے چاہے تو خیر کا راستہ اختیار کرے اور چاہے شر کے راستے کا انتخاب کرے بہر صورت آزاد ہے'' عقیدہ عالم خلق و امر کے فرق کی از خود نفی کر دیتا ہے، اس عقیدہ کے حاملین کہتے ہیں کہ عالم امر وقت کا محتاج نہیں ہوتا یعنی اس عالم میں حکم الٰہی آناً فاناً واقع ہو جاتا ہے اسکی دلیل وہ قرآن سے یہ دیتے ہیں کہ:

﴿وما امرنا الا واحدة كلمح بالبصر ☆ سورة القمر ۵۰﴾

یعنی ''ہمارا امر پلک جھپکتے ہی واقع ہوجاتا ہے'' لیکن یہ استدلال درست نہیں کیونکہ یہاں ذکر قیامت کا ہورہاہے اورامر سے مراد قیامت ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر اسکی وضاحت ہے، فرمایا:

﴿ولله غیب السماوات والارض وماامرالساعة الاکلمح البصر اوھو اقرب ان اللہ علی کل شئی قدیر ☆ سورالنحل ۷۷﴾

یعنی ''آسمانوں اورزمین کا غیب اللہ ہی کے پاس ہے اورامر قیامت ایسا ہے جیسا کہ ایک آنکھ کا جھپک جانا یااس سے بھی زیادہ قریب، بےشک اللہ ہر شئے پر قادر ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق میں سے جب اورجس چیز کو چاہے پلک جھپکتے بنا بھی سکتا ہے اورمٹا بھی سکتا ہے اسکے لئے وہ کسی علیحدہ عالم محتاج نہیں ہے بلکہ بسااوقات پلک جھپکتے میں کسی کام کوکردینے کی قوت اسی عالم خلق میں اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کوبھی عطاء کرتا ہے مثلاً سلیمان علیہ السلام کے درباریوں میں سے ایک شخص کے بارے میں قرآن کی شہادت ہے کہ اس نے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکتے ہی ملک یمن سے فلسطین پہنچادیا تھا۔

بعض لوگ سورۃ الاعراف کی آیت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دوعالم پیدا کیے ہیں ایک عالم خلق اوردوسرا عالم امر ہے حالانکہ یہ درست نہیں بلکہ اس آیت کریمہ کے الفاظ اورترجمہ درج ذیل ہیں:

﴿الالہ الخلق والامر☆سورۃ الاعراف ۵۴﴾

یعنی ''جان لوکہ تمام مخلوق اللہ کی ہے اوراس مخلوق میں حکم کا اختیار بھی اللہ ہی کا ہے'' یہاں خلق اورامر دوعلیحدہ علیحدہ عالم نہیں بلکہ خلق پر اختیار اورحکومت کوامر کہا گیا ہے، پرویز صاحب لفظ ''خلق'' کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿خلق کے معنی ہیں کسی چیز کو بنانے یا کاٹنے کیلئے اسے ماپنا، اسکا اندازہ لگانا (یہی مفہوم تقدیر کا بھی ہے) اسکے تناسب وتوازن کودیکھنا یاکسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مطابق بنانا، کسی چیز کونرم وہموار کرنا نیز ایک چیز کودوسری چیز سے بنانا ☆ لغات القرآن ص ۶۱۵﴾

اور ''امر'' کی لغوی بحث کرتے ہوئے پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

﴿امر کے معنی حکم کے بھی ہیں اور حالت، معاملہ، کام یا بات کے بھی ہیں اور جب اسکے معنی حکم کے ہوں تو اسکی جمع آوامر آتی ہے جہاں امر نہی کی ضد ہے اور جب اسکے معنی معاملہ حادثہ یا واقعہ یا حالت ہوں تو اسکی جمع امور آتی ہے ☆لغات القرآن ص ۲۵۶﴾

یہاں پرویز صاحب کی لغت سے بھی اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ خلق اور امر کوئی الگ الگ دو عالم ہیں بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ خلق اور امر دونوں کا تعلق اسی عالم سے ہے جسمیں ہم رہتے ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا اور جیسا کہ پرویز صاحب نے فرمایا کہ خلق اور امر دو علیحدہ علیحدہ عالم ہیں تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اس عالم میں امر اللہ کا کوئی عمل دخل نہیں کیونکہ عالم امر تو دوسرا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے بعد اس عالم کو امر یا حکم سے اختیار میں لینے کے بجائے شتر بے مہار کے طرح کھلا چھوڑ دیا ہے کہ اب یہاں کوئی کچھ بھی کرتا رہے اس پر گرفت کرنے کا معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ کو کوئی اختیار نہیں بلکہ کچھ قاعدے اور قانون ہیں جن کے مطابق سارا نظام خود بخود چلتا رہتا ہے اور جو کوئی اپنی چالبازی سے ان قوانین کو دھوکا دے سکے یا قابو پا سکے وہ کامیاب ہو جائے چناچہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿عالم خلق میں خدا کا امر قاعدے اور قانون کی چار دیواری میں محدود ہو گیا اور وہ مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا ☆ کتاب التقدیر ص ۳۹﴾

قرآن کریم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی متعدد صفات بیان کیں ہیں جیسے العلیم، الخبیر، السمیع، البصیر اور الرقیب وغیرہ پس پرویز صاحب کے بقول اگر اس عالم میں اللہ کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہے تو ان تمام صفات کا کیا فائدہ ہوا کیونکہ کسی کی کوئی بھی صفت اسی وقت مؤثر ہوگی جب اس صفت کے استعمال پر پابندی نہ ہو مثال کے طور پر ایک شخص کے ہاتھ بھی ہیں پاؤں بھی ہیں مگر وہ شخص فالج زدہ ہے تو ایسا شخص اپنے ہاتھ یا پاؤں سے کسی دوسرے کو کوئی فائدہ یا نقصان کس طرح پہنچا سکتا ہے اسی طرح آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿لاتأخذہ سنۃ ولانوم﴾یعنی ''اللہ تعالیٰ کو نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ آتی ہے'' یعنی اس کائنات پر اسکی گرفت ہر وقت اور ہر لمحہ موجود ہے یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کائنات کے قوانین بنا کر فارغ ہے تو پھر نیند یا اونگھ کے نہ آنے کا ہم کو بتانے کا کیا فائدہ ہوا صاف ظاہر ہے کہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم

ہر وقت اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہو اور تم جس وقت بھی اسے پکارو گے وہ تمہاری پکار سننے گا اور ہر مافوق الفطرت یا ماتحت الفطرت طریقہ سے تمہاری مدد پر قادر مطلق ہوگا اور دنیا کا کوئی قاعدہ اور قانون اسکی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکے گا۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ پرویز صاحب نے مسئلہ تقدیر پر بحث سے قبل ''خلق اور امر'' کے مسئلہ کو آخر کیوں چھیڑا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ضمن میں وارد مختلف آیات (جن کا تذکرہ ہم اس کتاب کے مقدمہ میں کر چکے ہیں) کو کسی ایک رخ پر موڑنے کے لئے ایک سہارا درکار تھا جو عالم خلق اور عالم امر کے خودساختہ تصور سے مل گیا جس کے نتیجہ میں پرویز صاحب نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ:

﴿ خدائے جلیل، لامحدود اختیارات کا مالک، قادر مطلق لیکن اس نے اپنے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر اپنے اوپر پابندی عائد کرلی اور اشیاء کائنات بھی ان قوانین کے لئے مجبور پیدا کی گئیں جبکہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا☆ کتاب التقدیر ص ۵۱﴾

اپنے اسی عقیدہ کی بنیاد پر پرویز صاحب نے تمام خرق عادت کام مثلاً معجزات اور عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کی پیدائش کا صریح انکار کیا ہے جس کا کھلا ثبوت پرویز صاحب کی تصانیف مثلاً مفہوم القرآن، تبویب القرآن، لغات القرآن وغیرہ میں بکثرت موجود ہے پرویز صاحب کے قول کے مطابق اس کائنات میں صاحب اختیار صرف انسان ہے جبکہ دیگر تمام اشیاء مجبور ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے اوپر ازخود پابندی عائد کرلی ہے اب ہم دیکھیں گے کہ اگر کوئی شخص پرویز صاحب کے اس نظریہ کا حامل ہو تو اس دنیا میں اسکا طرز عمل کیا ہوگا؟ کیا کوئی ایسا شخص جس کا عقیدہ یہ ہو کہ کائنات کے قوانین ہی اسکی زندگی بنانے اور بگاڑنے میں مکمل کردار ادا کرتے ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص دل سے کرسکتا ہے یا کسی مشکل میں پھنس جانے کی صورت میں کبھی اللہ تعالیٰ کو پکارے گا؟ کیا ایسا شخص بلا استثناء تمام احکامات الٰہیہ کی پابندی کرسکتا ہے خاص طور پر ان احکامات کی جو بظاہر اسکے مفاد میں بھی نہ ہوں؟ اور کیا ایسا شخص اس وقت اپنے آپ کو مایوسی سے بچا سکتا ہے جب اسکی تمام تر کوششوں اور کائناتی قوانین کی مکمل پابندی کے باوجود اسکی

محنت کا ثمر اسکے ہاتھ سے جاتا رہا ہو؟ صاف ظاہر ہے کہ نہیں کیونکہ اسکا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قوانین بنا دینے کے بعد اپنے اوپر پابندی عائد کرلی ہے چنانچہ اب اللہ تعالیٰ کسی مافوق الفطرت طریقہ سے اسکی مدد نہیں کرسکتا اسکے برخلاف کوئی بھی ایسا شخص جو عالم خلق اور عالم امر کے علیحدہ ہونے کا قائل نہ ہو وہ ہر مشکل کے موقع پر اللہ تعالیٰ کو صدق دل سے پکارے گا اور اسکی تمام تر محنت اور کوشش کے باوجود اگر کسی کام کا نتیجہ خلاف توقع نکلے گا تو وہ مایوس ہو کر نہیں بیٹھ جائے گا بلکہ اسے اپنی تقدیر کا لکھا سمجھکر ضبط وتحمل کا مظاہرہ کریگا اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔

لفظ ''گمراہی'' کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

قرآن کی جن آیات میں انسان کے گمراہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے وہاں مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو گمراہی کے راستے پر چلنے کا حکم دیتا ہے یا اس کو غلط راستہ بتاتا ہے یہ دراصل ہماری اردو زبان کی مجبوری ہے کہ عربی کے لفظ ''یضل'' کا حقیقی مترادف معنی اردو زبان میں موجود نہیں جس کی وجہ سے تقریباً تمام مترجمین نے اس لفظ کا معنی ''گمراہ'' بیان کیا ہے مگر اردو زبان کا لفظ ''گمراہ'' اللہ تعالیٰ کی صفت قرار نہیں پاسکتا قرآن کا ترجمہ کرنے والے اکثر مترجمین نے بہت سی آیات میں انسان کو گمراہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے جو غلط ہے درحقیقت وہاں گمراہ کرنا مراد نہیں بلکہ گمراہ قرار دینا مراد ہے اور اردو زبان میں اسکا یہی معنی کرنا چاہیے کیونکہ گمراہ کرنے کی آیات سے مراد اللہ تعالیٰ کا ''خذلان'' ہے یعنی نیکی اور اچھے عمل کی توفیق سے محروم کر دینا اور کسی شخص کو اسکے برے اعمال کے باعث شیطان کے حوالے کر دینا جیسا کہ سورۃ الزخرف ارشاد فرمایا کہ:

﴿ ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض له شیطانا فھو له قرین ☆۳۶ ﴾

یعنی ''جو شخص اللہ کے ذکر سے روگردانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر شیطان کو مسلط کر دیتا ہے پھر وہ شیطان اسکا ساتھی بن جاتا ہے'' اسی طرح سورۃ الکھف میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿ من یھدالله فھوا المھتد ومن یضلل فلن تجد له ولیامرشدا ☆ ۱۷ ﴾

یعنی ''جسے اللہ تعالیٰ ہدایت عطاء کرے وہی ہدایت حاصل کرسکتا ہے اور جسے گمراہ یعنی ہدایت سے محروم کرے تو تم کبھی اسکے لئے راہنمائی کرنے والا دوست نہیں پاؤ گے'' یہاں ہم نے لفظ ''یضلل'' کا معنی ''ہدایت سے محروم کردے'' کیے ہیں کیونکہ اردو زبان میں ''گمراہ'' کرنے کا ایک لغوی معنی ہے اور ایک اصطلاحی معنی ہے اور اس لفظ کا جو مفہوم عوام میں لیا جاتا ہے وہ اسکا لغوی معنی ہے یعنی کسی کے آگے اسکا صحیح راستہ گم کردینا اور اسی لغوی معنی کے اعتبار سے علماء نے قرآن مجید میں لفظ ''اضل یضل'' کا معنی گمراہ کیا ہے یعنی جو شخص کفر و نفاق اور بدعملی میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے علم سے جان لیتا ہے کہ اب یہ ایمان، اسلام اور نیکی کے کام کے قابل نہیں رہا اور یہ تادم مرگ کبھی واپس نہیں آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنی خصوصی عنایت اٹھالیتا ہے اور اسکو ازلی دشمن شیطان کے حوالے کردیتا ہے پھر وہ شیطان کے چنگل سے کبھی چھٹکارا نہیں پاسکتا، یہی وہ لغوی معنی ہیں جس کے باعث اکثر قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرنے والوں نے لفظ ''گمراہ'' استعمال کیا ہے جبکہ اسکا دوسرا وہ اصطلاحی مفہوم جو عوام الناس عام طور پر اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں یہ ہے کہ کسی راستہ چلنے والے کو اس کے اصل راستے سے ہٹا کر کسی دوسری غلط سمت میں موڑ دینا یہ عمل گمراہ کرنے کے ساتھ ساتھ دھوکہ دہی اور بے ایمانی پر بھی مشتمل ہوتا ہے چنانچہ اس قسم کی گمراہی کے فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا قطعی جائز نہیں، اللہ تعالیٰ اس نوعیت کی گھناونی حرکت سے پاک اور منزہ ہے لہذا اس اعتبار سے قرآن کریم میں وارد لفظ ''اضل یضل'' کا معنی گمراہ کرنا جائز نہیں ہوگا مزید برآں جب لفظ ''اضل یضل'' کا ترجمہ لغوی اعتبار سے ''گمراہ'' کیا جائے تو اس وقت بھی اس لفظ کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ نہیں ہوگا بلکہ اس وقت اس فعل کی نسبت اصل فاعل کے بجائے اس کے سبب کی طرف ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ اپنی توفیق اس انسان سے اٹھالینے کے باعث اسکی گمراہی کا سبب بن جاتا ہے اس طرح اس انسان کی گمراہی کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی جانب کرتا ہے حالانکہ اصل میں اسکو گمراہ کرنے والا اسکا اپنا نفس اور شیطان ہوتے ہیں اور انسان کی گمراہی کے اسباب مختلف اوقات میں مختلف ہوسکتے ہیں مثلاً سورۃ بقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ان اللہ لایستحی ان یضرب مثلا مابعوضة فمافوقها فاماالذین امنوا فیعلمون انه الحق من ربهم واما الذین کفروا فیقولون ماذا اراد اللہ بهذا

مثلا یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا ومایضل به الاالفاسقین ☆ ۲۶ ﴾

یعنی ''بے شک اللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیا کرنے سے نہیں شرما تا خواہ وہ مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی ہلکی کسی چیز کی ہو، ایمان لانے والے تو اسے اپنے رب کی جانب سے حق سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اللہ نے اس مثال سے بھلا کیا مراد لی ؟ اسکے ذریعہ سے اللہ بیشتر کو گمراہ کرتا ہے اور اکثر لوگوں کو راہ راست پر لاتا ہے اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کو کرتا ہے'' اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت و گمراہی کے فلسفہ کو نہایت شرح و بست کے ساتھ بیان کر دیا ہے جسمیں بنیادی بات یہ بیان کی کہ گمراہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو فاسق ہوں یعنی ان کی نیت اور عمل میں پہلے سے ہی کھوٹ ہوتا ہے تب اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کسی نہ کسی آزمائش میں ڈالتا ہے پھر وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو اللہ کے علم میں ہدایت کے مستحق ہوتے ہیں وہ آزمائش میں کامیاب ہو کر ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں جس طرح مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مچھر کی مثال بیان کر کے مومنوں کو کافروں سے اس طرح علیحدہ کر لیا جس طرح دہی پھینٹ کر مکھن کو چھاچھ سے علیحدہ علیحدہ کر لیا جاتا ہے اسطرح قرآن کی کوئی آیت ایک گروہ کیلئے ہدایت کا باعث ہوتی مگر وہی آیت کسی دوسرے گروہ یا شخص کیلئے گمراہی کا موجب بن سکتی ہے یعنی مومنین کیلئے بحیثیت مجموعی قرآن شفاء اور رحمت جبکہ فاسقوں اور کافروں کیلئے یہی قرآن زحمت بھی بن سکتا ہے جیسا کہ امت مسلمہ کے اکثر گمراہ فرقوں نے اپنے لئے گمراہی کا سامان قرآن سے ہی حاصل کیا مثلاً خوارج اور جبریہ فرقوں نے اپنے لئے گمراہی کا سامان قرآن سے حاصل کیا اسی طرح موجودہ دور میں قادیانیوں نے اپنی گمراہی پر مہر تصدیق قرآن کی آیات سے ثبت کی اسی طرح بریلوی اور دیوبندی حضرات نے اپنے غلط عقیدوں کی تائید بعض متشابہ آیات کی غلط تفسیروں سے کی اور قرآن کو اپنے لئے زحمت بنایا حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بالفعل گمراہ نہیں کرتا بلکہ ایسے اسباب پیدا کرتا ہے جو کسی کے دل میں چھپی ہوئی خباثت کو ظاہر کر دیتے ہیں جس طرح ابلیس کے دل میں چھپے ہوئے تکبر کو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیکر ظاہر کر دیا اسی اصول کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ جاثیہ میں یوں بیان کیا کہ:

﴿ واضله الله علی علم ☆ ۲۳ ﴾

یعنی ’’جن لوگوں نے اپنی خواہشات نفس کواپنا الہ بنا رکھا ہے اللہ تعالیٰ کو ازل سے ان کا علم تھا اسلئے اللہ نے ان کو اپنے علم الغیب کی بنیاد پر گمراہ قرار دیا یا گمراہ لکھدیا ہے‘‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی برائی کا حکم نہیں دیتا بلکہ سورۃ النحل کی ایک آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ عدل ،احسان، رشتہ داورں سے حسن سلوک اور برائی سے دور رہنے کو حکم دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کیلئے ’’گمراہ کرنے‘‘ کا لفظ ان معنوں میں استعمال کرنا جائز نہیں جن معنوں میں ہماری اردو زبان مستعمل ہے اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو لفظ ’’اضل یضل‘‘ آیا ہے اسکی وضاحت علامہ راغب اصفہانی نے یوں کی ہے کہ:

﴿ واضلال اللہ تعالیٰ للانسان علی احد وجھین.احد اھما ان یکون سببه الضلال وھوان یضل الانسان فیحکم اللہ علیه بذالک فی الدنیا ویعدل به عن طریق الجنة الی النار فی الاخرة وذالک ھو اضلال حق وعدل فا الحکم علی الضال بضلالة والعدول به عن طریق الجنة الی النار عدل و حق والثانی من اضلال اللہ ھوان اللہ تعالیٰ وضع جبلة الانسان علی ھئیة اذا راعی طریقا محمودا کان او مذموما الفه واستطابه ولزمه وتعذر صرفه وانصرافه عنه ویصیر ذالک کاالطبع الذی یایٔ علی الناقل و لذالک قیل العادة طبع ثان وھذہ القوة فی الانسان فعل الٰھی واذا کان کذالک وقد ذکر فی غیر ھذا الموضع ان کل شئی یکون سببا فی وقوع فعل صح نسبة ذالک الفعل الیه فصح ان ینسب ضلال العبد الی اللہ من ھذا الوجه فیقال اضله اللہ لا علی الوجه الذی یتصور الجھلة ولما قلناہ جعل الاضلال المنسوب الی نفسه للکافروالفاسق دون المئومن بل نفی عن نفسه اضلال المئومن فقال وماکان اللہ لیضل قوما بعد اذا ھداھم حتی یبین لھم مایتقون ☆ سورة توبه ۱۱۵،وقال للکافر والفاسق فتعسالھم واضل اعمالھم ☆ سورة محمد۸﴾

یعنی ”انسان کے گمراہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دو اعتبار سے کی جاتی ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے گمراہ انسان پر گمراہی کا حکم لگایا یعنی وہ گمراہ خود ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اس اختیاری عمل پر گمراہ ہونے کا حکم لگایا اور اسکا مقام جنت کے بجائے جہنم کو قرار دیا، اللہ تعالیٰ کا اس پر گمراہ ہونے کا حکم لگانا حق اور عین انصاف ہوتا ہے اور جہنم کو ایسے شخص کی قسمت قرار دینا نہایت موزوں اور مطابق واقعہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایسے شخص کو گمراہ کرنے کا دوسرا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو ایسی حیثیت سے پیدا فرمایا ہے کہ وہ جس راستے پر چلنے کی عادت ڈال لیتا ہے وہ اسکو چھوڑنا گوارا نہیں کرتا خواہ وہ راستہ صحیح ہو یا غلط وہ اپنے لئے اسی کو اچھا سمجھتا ہے اور اسی پر مرمٹنے کے لئے تیار رہتا ہے اور یہ عادت ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے جیسے کسی نے مہر لگا دی ہو اسلئے بطور مثال کہا جاتا ہے کہ عادت اصل مہر پر دوسری مہر ہوتی ہے اور انسان کے اندر ایسی عادتی قوت پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو حقیقی اور اصلی فاعل ہے کیونکہ وہی ہر چیز کا خالق ہے خواہ وہ شر ہو یا خیر ہو اور یہ بات اپنی جگہ پر مذکور ہے کہ کسی فعل کا جو شئی سبب ہوتا ہے اس فعل کی نسبت اسکی طرف کرنا جائز ہوتا ہے اور چونکہ ہر عمل کی قوت جو انسان میں ہوتی ہے اسکا خالق اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اسی اعتبار سے انسان کے گمراہ کرنے کی نسبت قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب کی گئی ہے نہ کہ اس اعتبار سے جو کہ جہلا سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے انسان کو گمراہ کرنے کی نسبت کافر اور فاسق کی طرف کی گئی ہے مؤمن کی طرف نہیں کی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ سے مؤمن کو گمراہ کرنے کی نفی ثابت ہے جیسا کہ سورۃ التوبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ جس قوم کو ہدایت عطاء فرماتا ہے پھر اسے گمراہ نہیں کرتا“ اور کافروں کے بارے میں سورۃ محمد میں ارشاد ہوا کہ ”کافروں کے لئے ہلاکت ہے اور انکے اعمال برباد کردیے جاتے ہیں“

پس یہاں علامہ راغب اصفہانیؒ نے دوٹوک اور فیصلہ کن بات کہی ہے کہ انسان کو گمراہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کے صرف دو ہی اسباب ہیں اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہ لکھا ہے اور ان پر گمراہ ہونے کا حکم لگایا ہے اور ثانیاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر خیر و شر کی قوت پیدا کی ہے پس جس انسان کے اندر شر کی قوت غالب آجاتی ہے اور وہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے تو اسکی گمراہی کی نسبت شر کا خالق ہونے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب کی ہے یعنی گمراہی کے فعل کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ نہیں ہوتا اس

لئے اردو زبان میں دستیاب قرآن مجید کے تراجم جن میں گمراہی کے فعل کی مطلق نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے ان سے عوام الناس میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور پرویز صاحب جیسے شاطر لوگ ایسی باتوں کا سہارا لے کر قرآن کے اسلوب اور عربی زبان سے ناواقف لوگوں کو خوب گمراہ کرتے ہیں۔

''جبر'' اور ''قدر'' کا بنیادی فرق:

انسانوں کی تقدیر لکھنے کا جو ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ میں ملتا ہے اس سے کسی جبر واکراہ کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیدائش کے بعد لوگ جو نیکی یا برائی کا عمل اپنی مرضی سے کریں گے اللہ تعالیٰ کو اسکا علم ان کی پیدائش سے ہزاروں برس قبل تھا اور اللہ تعالیٰ نے انکے ہر متوقع عمل کو لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور فیصلہ کر دیا تھا کہ جو کچھ کسی شخص کے بارے میں ہم نے لکھا ہے اسکے خلاف ہونا قطعی ناممکن ہے کیونکہ اگر ایسا ہو جائے کہ کسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اسکے خلاف عمل کرے تو اللہ تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا غلط ثابت ہو جائے گا بس تقدیر انسانی کے لکھے جانے کی صرف یہی حقیقت ہے لیکن تقدیر کا یہ لکھا جانا دنیا کے بہت سے لوگوں کے لئے فتنہ کا باعث بھی بن گیا اور انھوں نے اسے جبر سمجھتے ہوئے تقدیر کا کلی طور پر انکار کر دیا مثلاً پرویز صاحب تقدیر کو جبر قرار دیتے ہیں جس طرح جبریہ فرقہ نے سمجھا تھا اور تقدیر پر ایمان کو ابلیس کا طرز عمل قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ﴿ قرآن کریم میں جبر اور اختیار کے مسئلہ کو قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں نہایت دل نشین طریق سے حل کر دیا ہے خدا نے آدم کو بھی ایک حکم دیا اور ابلیس کو بھی، آدم سے بھی اس حکم کی معصیت سرزد ہوئی اور ابلیس سے بھی، جب آدم سے پوچھا گیا تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کہا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہم اسکا اعتراف کرتے ہیں ہم نادم ہیں شرمسار ہیں یعنی آدم نے اسکا اعتراف کیا کہ اس معصیت کا ذمہ دار وہ خود ہے اسکے برعکس جب ابلیس سے یہی سوال کیا گیا کہ تم نے حکم خداوندی سے سرتابی کیوں برتی ہے تو اس نے خدا سے کہا کہ ''اے رب تو نے مجھے گمراہ کیا ہے'' یہاں سب کچھ تیرے حکم سے

ہوتا ہے تو نہ چاہتا تو میں سرکشی کس طرح اختیار کرسکتا تھا☆ کتاب التقدیر ص ۵۳، ۵۴﴾

پرویز صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قصہ آدم وابلیس کو محض ایک تمثیلی قصہ سمجھتے ہیں اوران کے نزدیک اس سے آدم وابلیس نام کی کوئی خاص شخصیتیں مرادنہیں اس اعتبار سے پرویز صاحب کوصرف منکرحدیث کہنا صحیح نہیں بلکہ قصہ آدم وابلیس کی حقیقت کاانکارکرکے وہ منکرومحرف قرآن بھی قرار پاتے ہیں نیز پرویز صاحب کے کے یہ الفاظ کہ ''اے رب تونے مجھے گمراہ کیا ہے یہاں سب کچھ تیرے حکم سے ہوتا ہے'' شیطان کے یہ الفاظ قرآن میں کہیں نہیں ہیں بلکہ یہ پرویز صاحب کی اپنی ذہنی اختراع ہے اورابلیس اتنا جاہل نہیں تھا کہ ایسی بات کہتا کہ میرا سجدہ نہ کرنا رب کے حکم سے تھا بلکہ ابلیس کے الفاظ ''فبما اغویتنی'' کا ترجمہ ''تونے مجھے گمراہ کیا'' کرنا بھی غلط ہے اسکے بجائے اسکا صحیح معنی ''تونے مجھے گمراہ قرار دیا'' ہوں گے نیز اللہ تعالیٰ نے ابلیس کوکوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا جس کواسکی گمراہی کہا جائے بلکہ اس حکم کی سرتابی اسکے لئے گمراہ قرار دیئے جانے کا سبب بنی تھی پس یہ طرزعمل کسی کوبھی زیب نہیں دیتا کہ غلطی سرزد ہوجانے کے بعداپنی غلطی کی ذمہ داری خودقبول کرنے کے بجائے ان اسباب وعوامل پرڈال دے جواسے اس غلطی کے کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہوں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات آسمان پرآدم علیہ السلام سے ہوئی تو موسیٰ نے آدمؑ سے کہا کہ اگرآپ جنت میں شجرممنوعہ سے نہ کھاتے تو ہم مزے سے جنت ہی میں ہوتے اور دنیا کی مشکلات سے ہمارا سابقہ نہ ہوتا اس کے جواب میں آدمؑ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ غلطی میرے نامہ اعمال میں میری پیدائش سے قبل ہی لکھدی تھی پھرمیں وہ غلطی کیسے نہ کرتا اس پرموسیٰ علیہ السلام لاجواب ہوگئے یعنی آدمؑ نے جب تقدیر سے استدلال کیا تو موسیٰؑ کچھ نہیں بولے معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کا جواب اسی وقت ممکن ہے جب غلطی سے گناہ سرزد ہوجائے اورعمداً گناہ کرنے کی صورت میں اسطرح کا استدلال ممکن نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ ابلیس کا یہ کہنا کہ ''اے رب تونے مجھے گمراہ قراردیا'' تقدیرپرایمان سے متعلق نہیں، قرآن کریم میں ایک مقام پرابلیس کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ ''فبما اغویتنی☆ سورۃ الاعراف'' اوردوسرے مقام پر ''رب بما اغویتنی☆ سورۃ الحجر'' یہاں لفظ [اغویتنی] قابل غور ہے بعض علماء نے اسکا معنی کیا ہے [اھلکتنی] یعنی آپ نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا، اورتفسیر

بحرالمحیط میں علامہ ابوحیان اندلسی نے ابلیس کے قول [فبما اغویتنی] کے بارے میں لکھا ہے کہ:

﴿ وقیل سمیتنی غاویا لتکبری عن السجود ☆ ص ۲۷۵ ج ۴ ﴾

یعنی ''آپ نے مجھے میرے سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے گمراہ قرار دیا جو میرے تکبر کی وجہ سے تھا'' حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ''ابن عباس نے [اغویتنی] اس کا معنی کیا ہے [کما اضللتنی]'' اس لفظ کی ہم بعد میں تشریح کریں گے لیکن جن لوگوں نے اسکا معنی [اھلکتنی] کیا ہے اسکی دلیل سورۃ مریم کی یہ آیت ہے کہ ''فسوف یلقون غیا'' یعنی ''جو لوگ نمازوں کو ضائع کرتے ہیں عنقریب وہ ہلاکت سے دوچار ہوں گے'' اور امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں اسکا معنی لکھا ہے کہ ''آپ نے مجھکو لعنت کی ہے اس لئے میں آدم کی اولاد کو گمراہ کروں گا'' اور ابلیس پر لعنت کرنا قرآن میں مذکور ہے جیسا کہ سورۃ ص میں ارشاد فرمایا ''تو یہاں سے نکل جا تو مردود ہوا، اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہے'' اور عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق اس آیت کا معنی ہوگا ''جس شخص اور ذات کے سبب آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا اور میری گمراہی ظاہر کی میں اسکی اولاد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا'' ابن عباسؓ کے لفظ [کما اضللتنی] کا ہم نے یہ معنی کیا ہے کہ ''آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا یا میری گمراہی ظاہر کی ہے یا میری گمراہی کا آپ سبب بنے ہیں'' یعنی اسکا ترجمہ ہم نے عام تراجم کی طرح یہ نہیں کیا کہ ''آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے'' کیونکہ لفظ [گمراہ کرنا] اردو زبان میں لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے الگ الگ مفہوم دیتا ہے اسکی تفصیل ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں البتہ جو گناہ سہواً سرزد ہو جائے اس ضمن میں صحیح طرز عمل یہ ہے انسان اس خطاء کو اپنی طرف منسوب کرے اور جب کوئی نیکی یا اچھائی کا کسب کرے تو اس اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور توفیق پر منطبق کرے جیسا کہ قرآن میں اہل جنت کا قول نقل کیا گیا ہے کہ:

﴿ ونزعنا مافی صدورھم من غل تجری من تحتھم الانھار وقالوا الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقدجأت رسل ربنا بالحق ونودوا ان تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون ☆ سورۃ الاعراف ۴۳ ﴾

یعنی''ان کے دلوں میں جو کدورتیں ہوں گی ہم انکو دھوڈالیں گے اور وہ کہیں گے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں ہدایت دی اور ہم ہرگز ہدایت حاصل نہ کر پاتے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا، بے شک رسول حق کے ساتھ ہمارے پاس آئے، تب ندا آئے گی کہ یہ جنت جو تمہیں ملی ہے تم اسکے وارث اپنی اعمال کی وجہ سے بنے ہو'' یہاں اہل جنت نے اپنے اعمال کا نتیجہ جنت کو قرار نہیں دیا بلکہ اس انعام کو اللہ تعالیٰ کا احسان قرار دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تقدیر میں ہدایت لکھی تھی بصورت دیگر وہ نہ ہدایت پاتے، نہ ہی نیک اعمال کر سکتے اور نہ جنت میں داخل ہوتے یعنی انسان کو اپنے اچھے عمل کو بھی اپنا کسب کہنے سے گریز کرنا چاہیے جبکہ برے عمل کا ذمہ دار خود کو سمجھنا چاہیے لیکن چونکہ ابلیس نے ایسا نہیں کیا اسلئے وہ ملعون قرار پایا اور چونکہ سجدہ کے فعل کا سبب اللہ تعالیٰ تھا اس لئے اغویتنی کے ظاہر لفظ کی نسبت اسکی طرف کردی گئی ورنہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا جو ابلیس کے لئے گمراہی کا فعل ہو یعنی ابلیس کا آدمؑ کو سجدہ نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی جبر کی بنا پر نہیں بلکہ ابلیس کے ذاتی تکبر کی بنا پر تھا البتہ اسکا یہ تکبر کرنا اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہمیشہ سے تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر ابلیس کے اس فعل کو اسکے واقع ہونے سے قبل کائنات کی پیدائش کے وقت کتاب مکنون میں لکھ دیا تھا جسے ہم ابلیس کی تقدیر کہہ سکتے ہیں اس بحث سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ''جبر'' اور ''قدر'' ایک ہی چیز کے دو نام نہیں بلکہ یہ دو الگ اور مستقل الفاظ ہیں جنہیں آپس میں ایک دوسرے کا متبادل قرار دینا محض جہالت ہے۔

لفظ ''قانون'' کی پرویزی تشریح:

پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ قرآن کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ متعلقہ موضوع کے متعلق قرآن کریم میں جہاں جہاں جو کچھ آیا ہے اسے سامنے رکھکر یہ سمجھا جائے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے اور پھر اسکی اس بنیادی تعلیم کی رو سے متعلقہ آیات کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم متعین کیا جائے ☆ کتاب التقدیر ص ۲۶۵ ﴾

پرویز صاحب کے اس خود ساختہ اصول نے جو حشر قرآن پر ڈھایا ہے اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں البتہ مسئلہ تقدیر کے ضمن میں اس پرویزی اصول کی کچھ شعبدہ بازیاں ہم قارئین کے سامنے ضرور پیش کرنا چاہیں گے اس سلسلہ میں پہلے اصول ''متعلقہ موضوع کے متعلق قرآن میں جہاں کہیں جو کچھ آیا ہے'' کا جائزہ حاضر ہے چنانچہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿قرآن کریم میں قانون کا لفظ تو نہیں آیا لیکن اسکی ساری تعلیم قانون کے تصور کے گرد گھومتی ہے اور دین کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے، قانون سے مراد عدالتی قانون ہی نہیں یہ ایک بڑی وسیع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے، قانون سے مراد یہ ہے کہ ''اگر تم ایسا کرو گے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا'' ☆ تبویب القرآن ص ۱۱۰۷﴾

معلوم ہونا چاہیے کہ ''قانون'' عربی زبان کا لفظ ہے جو بقول پرویز صاحب قرآن میں آیا ہی نہیں اسکے باوجود پرویز صاحب قرآن کی پوری تعلیم کا مرکزی نقطہ ''قانون'' کو قرار دے رہے ہیں یہ انکی خاص تفہیم کا شاخسانہ ہے، پرویز صاحب کی کتاب التقدیر میں ''متعلقہ موضوع'' تقدیر ہے لیکن وہ تقدیر کا مطلب بھی قانون کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

﴿بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس چیز کو قرآن نے ''قدر'' کہہ کر پکارا ہے اسے ہماری اصطلاح میں قانون فطرت کہا جاتا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۳۹﴾

پرویز صاحب جب تقدیر کا معنی قانون فطرت کہہ کر کرتے ہیں اور وہ قانون فطرت میں تبدیلی کے بھی قائل نہیں تو پھر گویا تقدیر کی عدم تبدیلی بھی انہوں نے مان لی اگرچہ لفظ تقدیر سے نہیں مگر قانون فطرت کے لفظ سے اس حقیقت کو مان لیا ہے، پرویز صاحب اگر تقدیر کا معنی قانون فطرت کرتے ہیں تو انسان کو اس سے مستثنٰی قرار نہیں دے سکتے کیونکہ لغت کی مشہور کتاب القاموس میں قانون کی تعریف کے تحت لکھا ہے کہ ''والقانون مقیاس کل شئی جمعہ قوانین'' یعنی قانون ہر چیز کے ناپنے کے آلہ کا نام ہے تو اس اعتبار سے لفظ قانون لفظ تقدیر کے ہم معنی ہوا اور جس طرح ہر چیز پرویز صاحب کے نزدیک قانون فطرت کے تابع ہے اس سے باہر اسکا کوئی اختیار نہیں تو اسی طرح ہر چیز بشمول انسان تقدیر کے تابع ہوئی اسکے باہر اسکا کوئی اختیار

نہیں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الروم میں فرمایا کہ:

﴿فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لاتبدیل لخلق اللہ ☆ ۳۰﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے جس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں'' اس سے معلوم ہوا کہ انسان بھی قانون فطرت کے تابع ہے اس سے خارج نہیں علاوہ ازیں ماہرین لغت میں سے کسی نے بھی قدر کا مطلب قانون نہیں لکھا جبکہ پرویز صاحب با ادنیٰ تدبر ہی قدر کے معنی قانون سمجھ لیتے ہیں اسکا مطلب یہ ہوا کہ علماء، فقہاء اور ماہرین لغت میں سے کسی کو وہ ادنیٰ تدبر بھی حاصل نہیں تھا جو پرویز صاحب کو حاصل ہے اسی طرح کلمۃ اللہ اور سنت اللہ کا مطلب بھی پرویز صاحب کے نزدیک قانون ہے حالانکہ لغت میں ''کلمہ'' کے معنی ہیں ایک لفظ یا ایک بات یا ایک جملہ یا یک قصیدہ یا ایک خطبہ اسکی جمع کلمات آتی ہے جسکے معنی امور کے بھی ہیں اسی طرح لفظ ''سنت'' کے معنی ہوتے ہیں راستہ یا طریقہ یا معمول یا مسلک لیکن پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿قانون خداوندی کے لئے قرآن میں دو الفاظ آئے ہیں ایک کلمۃ اللہ اور دوسرے سنت اللہ، قرآن پر تدبر سے ان دونوں میں یہ فرق سامنے آجاتا ہے کہ ''کلمہ'' قانون کے نظری حیثیت ہے جسے فارمولا کہا جاسکتا ہے اور ''سنت اللہ'' اس فارمولے کی عملی شکل ہے یعنی جب وہ نظری قانون عملی پیکر اختیار کرلے تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جائے گا ☆ کتاب التقدیر ص ۴۳﴾

قرآن کریم کی جن آیات میں بھی سنت اللہ کے تبدیل نہ ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے ان تمام آیات کا سیاق وسباق اس بات پر شاہد ہے کہ ان مقامات پر سنت اللہ سے کفار پر عذاب بھیجنے کی سنت مراد ہے یعنی اس سے اللہ تعالیٰ کے جمیع اختیارات مراد نہیں ہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ ایک مرتبہ قوانین بنا دینے کے بعد اس کائنات پر اللہ تعالیٰ کا اختیار معاذ اللہ ختم ہوگیا ہے لیکن پرویز صاحب یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ کائنات کے تمام قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تاکہ تمام انبیاء کرام کے معجزات کے انکار کا دروازہ کھل سکے کیونکہ پرویز صاحب اور انکے متبعین کے خیال میں یہ معجزات اور خرق

عادت امور ان کو اہل مغرب کے سامنے نشانہ تضحیک بنا دیتے ہیں چنانچہ پرویز صاحب کے خصوصی تدبر نے یہاں یہ کارفرمائی دکھائی ہے اور یہ تدبر اس سے آگے بھی چل رہا ہے جہاں ''وعداللہ'' کا مطلب بھی قانون ہوتا ہے، لفظ ''وعدہ'' اردو زبان میں بھی مستعمل ہے جسکے معنی عہد یا پیمان ہوتے ہیں لیکن پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ خدا کے ''وعدے'' درحقیقت اسکے مقرر کردہ قوانین ہیں اور انکی خلاف ورزی نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی ☆ کتاب التقدیر ص ۴۷ ﴾

جبکہ ایک دوسرے مقام پر پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

﴿ خدا کے وعدوں سے مراد وہ نتائج ہیں جو اسکے قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں اور جن میں کبھی خطاء نہیں ہوتی اسی طرح ان قوانین سے سرکشی برتنے کے نتائج وعید ہیں ☆ لغات القرآن ص ۱۷۲۲ ﴾

اسکے بعد پرویز صاحب کا یہ تدبر ایک چھلانگ اور لگاتا ہے اور ''کتاب اللہ'' کا مطلب بھی قانون دریافت کر لیتا ہے حالانکہ لفظ ''کتاب'' کے معنی ہوتے ہیں فیصلہ یا حکم یا کسی لکھی ہوئی چیز کو بھی کتاب کہتے ہیں خواہ وہ چند الفاظ ہی کیوں نہ ہوں جبکہ پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ مادہ (ک،ت،ب) جس سے کتاب کا لفظ وضع ہوا ہے کے بنیادی معنوں میں ''قانون'' یا جو کچھ ازروئے قانون کسی پر واجب قرار دیا گیا ہو شامل ہے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر انہی معنوں میں آیا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۱۰۸ ﴾

اب تک جن الفاظ کو پرویز صاحب نے قانون سے تعبیر کیا وہ غالباً ان الفاظ کا مفہوم تھا کیونکہ اب وہ لفظ ''حکم'' کے معنی ہی قانون بتاتے ہیں حالانکہ لفظ ''حکم'' کا اطلاق ایسے فیصلہ پر ہوتا ہے جو عدل وانصاف کے ساتھ کیا جائے اور پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ اکثر کے نزدیک کتاب حکم کے معنی میں ہے، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا اسکی جگہ عام طور پر حکم کا لفظ آیا ہے حکم کے معنی فیصلہ کے ہوتے ہیں

اور جو فیصلہ یا حکم مستقل اور غیر متبدل ہو اسے قانون کہتے ہیں ☆ کتاب التقدیر ص ۱۰۹﴾

قرآن میں کتاب اور حکمت کا لفظ اکثر مقامات پر ساتھ ساتھ آیا ہے اسکا سبب بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿قرآن کریم میں ''کتاب وحکمت'' دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے، ''کتاب'' قانون کا ''اگر'' حصہ ہے اور ''حکمت'' اسکی ''تو'' ہے، اگر کسی حکم میں ''اگر کے ساتھ ''تو'' نہ ہوتو وہ حکم ''قانون'' کی حیثیت اختیار نہیں کرسکتا ☆ کتاب التقدیر ص ۱۶۳﴾

پرویز صاحب نے مسئلہ تقدیر کو اپنی مرضی کے مطابق حل کرنے کے لئے یہ بہترین نسخہ تلاش کیا ہے جہاں کسی آیت میں پھنس جاتے ہیں فوراً کسی نہ کسی لفظ کا مطلب '' قانون'' بتادیتے ہیں اسی روش پر چلتے ہوئے انھوں نے ''اذن اللہ'' کا مطلب بھی قانون بتایا ہے حالانکہ اس لفظ کے معنی مرضی یا اجازت کے ہوتے ہیں لیکن پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿جب خدا کا علم اور ارادہ عالم خلق میں کارفرما ہوتا ہے تو وہ قانون کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور جیسا کہ ہم حکم کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ جب ایک حکم مستقل طور پر دے دیا جائے اور وہ غیر متبدل ہو تو وہ قانون بن جاتا ہے یہی کیفیت ''اذن'' یعنی اجازت کی ہے، جب کسی بات کی اجازت مستقل طور پر دے دی جائے تو وہ ہماری اصطلاح میں قانون کہلائے گی قرآن میں ''اذن اللہ'' کی اصطلاح انہیں معنوں آئی ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۱۱۹﴾

قرآن کریم میں انشاء اللہ، ماشااللہ اور من یشاء وغیرہ کے الفاظ بار بار آئے ہیں اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے پرویز صاحب نے مشیت کے لفظ کو بھی قانون سے جوڑ دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

﴿طبعی کائنات میں جو قوانین فطرت کارفرما ہیں، قرآنی نقطہ نگاہ سے وہ بھی قوانین مشیت ہیں اور انسانی زندگی سے متعلق جو قوانین بذریعہ وحی عطا ہوئے ہیں انہیں بھی قوانین مشیت کہا جائے گا ☆ کتاب التقدیر ص ۱۹۶﴾

قرآن کریم میں بعض مقامات پر رزق کی بست وکشاد کو مشروط قرار دیا گیا ہے مثلاً ایک شرط ''ذکر''

ہے جس کا معنی نصیحت اور یاد دہانی ہیں لیکن پرویز صاحب نے اسکے معنی بھی قانون کئے ہیں، چناچہ لکھا کہ:

﴿ خدا کے قانون مشیت کے مطابق رزق کی بست و کشاد ہوتی ہے، چناچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ﴿ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنكا﴾ یعنی ''جو شخص یا قوم ہمارے قوانین سے اعراض برتے گی اس کی روزی تنگ ہو جائے گی'' ☆ کتاب التقدیر ص ۲۷۹﴾

پرویز صاحب سے ایک سوال ہے کہ اس زمانے میں یا اسے پہلے بھی دشمنان اسلام ہمیشہ مال و دولت اور عزت وحشمت کے ساتھ دنیا میں رہتے رہے ہیں جبکہ تقریباً تمام انبیاء کرام اور انکے متبعین نے دنیا میں نہایت کسمپری کی زندگی گذاری اسی طرح مسلمانوں نے بھی اپنے دور عروج سے قبل ایک طویل مدت تنگ دستی میں بسر کی اور جانثار صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد اسلام کے عروج سے قبل ہی وفات پا گئی اب سوال یہ ہے کہ کیا پرویز صاحب کی نظر میں وہ تمام شخصیات بھی ذکر [قوانین خداوندی] سے اعراض برتنے والی تھیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی کسمپری میں ہی بسر کر دی اسکے علاوہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ:

﴿ فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شئی حتی اذا فرحوا بما آوتوا اخذناهم بغتة فاذاهم مبلسون ☆ سورة الانعام ۴۴ ﴾

یعنی ''جب لوگ ذکر [نصیحت] کو بھول گئے تو ہم نے ان پر تمام نعمتوں کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوب مست ہو گئے تو ہم نے انکو دفعتاً پکڑ لیا پھر وہ مایوس ہو کر رہ گئے'' اگر پرویز صاحب کے بقول لفظ ''ذکر'' کا مطلب قانون خداوندی ہے تو پھر یہ آیت اس سے قبل نقل کی گئی آیت کی نفی پر مشتمل ہو جائے گی کیونکہ وہاں قوانین خداوندی سے منہ موڑنے والوں پر معیشت تنگ کرنے کر ذکر ہے جبکہ یہاں قوانین خداوندی سے اعراض کرنے والوں پر نعمتوں کی بارش ہونے کا تذکرہ ہے دراصل پرویز صاحب اپنی خصوصی قرآنی فکر کو عوام الناس پر تھوپنے کے لئے بعض اوقات اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ ''جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنے'' کا محاروہ ان پر صادق آنے لگتا ہے اسکی ایک مثال لفظ ''دعا'' جس کے معنی پکارنا اور مانگنا ہیں اسکی پرویزی تشریح ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

﴿سورۃ الانعام میں کہا گیا کہ کہو" میں غیر اللہ کو کیسے پکاروں جبکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں خدا کے سامنے ہی جھکوں اور اسکے سوا کسی کی اطاعت نہ کروں" ہدایت خداوندی اور اسکے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے الفاظ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ خدا کو پکارنے یعنی "دعا" سے مراد احکام وقوانین کی اطاعت کرنا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۳۶۳﴾

اور یہی نہیں بلکہ اسکے علاوہ بھی اور بہت سی اصطلاحات ہیں جن کے معنی حسب موقع پرویز صاحب قانون کرتے رہتے ہیں حتی کہ بعض مقامات پر رب کے معنی اور اللہ کے معنی بھی قانون کیئے ہیں اس اعتبار سے مؤمن، مشرک، کافر اور منافق کی اصطلاحات کے معنی ومفہوم کو بھی پرویز صاحب نے یکسر بدل ڈالا چناچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿جو شخص یہ مانتا ہے کہ فلاں کام کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے فلاں قانون اور قاعدہ ہے اسے مومن کہتے ہیں، جو کسی قاعدے قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتا وہ کافر کہلاتا ہے، جو کسی مقررہ قاعدہ اور قانون کے ساتھ اپنی طرف سے کچھ ملا دیتا ہے اسے مشرک کہتے ہیں، جو اس طرح کام کرے بظاہر نظر آئے کہ وہ قاعدہ قانون کی پابندی کر رہا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ کرے اسے منافق کہتے ہیں ☆ تبویب القرآن ص ۵۹۹﴾

کسی نے صحیح کہا ہے کہ بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں، اب قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ جب پرویز صاحب مسئلہ تقدیر سے تعلق رکھنے والی تمام دینی اصطلاحات کو توڑ مروڑ کر حسب منشاء معنی نکال لیں گے تو بقول پرویز صاحب مسئلہ تقدیر کا "قابل فہم وبصیرت" حل تو یقیناً نکل ہی آئے گا۔

تدبر اور قرآن فہمی کا پرویزی طریقہ:

پرویز صاحب نے جس تدبر وتفکر کی بدولت مفہوم القرآن مرتب کیا ہے اسے جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں چناچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

﴿فہم قرآن کے سلسلہ میں دو اصولی باتیں سمجھ لینا ضروری ہیں، سب سے پہلے یہ کہ قرآن

کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا ہے کہ ''یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے ، اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کثیر اختلاف پاتے''یعنی ایسا کہیں نہیں ہوگا کہ ایک جگہ تو وہ یہ کہہ دے کہ جس کا جی چاہے سیدھی راہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے گمراہ ہو جائے اور دوسری جگہ کہہ دے کہ تم اپنی مرضی سے کوئی راستہ اختیار نہیں کرسکتے ہم جسے چاہیں صحیح راستے پر لگادیں اور جسے چاہیں گمراہ کردیں، دوسری بات یہ کہ اگر قرآن کریم میں ایسی آیات ملیں جن میں بادی النظر میں تضاد دکھائی دیتا ہو تو نہ تو انہیں سطحی نظر سے دیکھنا چاہیے اور نہ ہی آنکھیں بند کرکے ان سے آگے بڑھ جانا چاہیے، قرآن نے اس مقصد کے لئے تدبر کو شرط قرار دیا ہے ان آیات میں تدبر و تفکر سے ان کا حقیقی مفہوم سامنے آجاتا ہے اور تضاد باقی نہیں رہتا ☆ کتاب التقدیر ص۱۹۲﴾

یہاں پرویز صاحب نے سورۃ النساء کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ اصول پیش فرمایا ہے کہ قرآنی آیت میں باہم اختلاف نہیں ہے اور جہاں کہیں بظاہر اختلاف ہے بھی تو وہ تدبر فی القرآن کے ذریعہ رفع کیا جاسکتا ہے اب قبل اسکے کہ ہم دیکھیں کہ پرویز صاحب کا اپنے اس اصول پر کتنا عمل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین کرام نے اس آیت کی کیا تفسیر کی ہے، تفسیر جلالین میں ہے کہ:

﴿ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا تناقضا فی معانیہ وتباینافی نظمہ ☆ تفسیر الجلالین سورۃ النساء﴾

یعنی ''اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو تم اسکے معنی میں نقض اور نظم میں اختلاف پاتے'' اور امام طبری ابن زید کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

﴿قال ابن زید:ان القرآن لایکذب بعضہ بعضا ولا ینقض بعضہ بعضا ☆ تفسیر الطبری سورۃ النساء﴾

یعنی ''قرآن کا بعض بعض کو جھٹلاتا نہیں ہے اور نہ ہی ایک حصہ دوسرے کی نفی کرتا ہے'' اور تفسیر قرطبی

میں ابن عباسؓ، قتادہ اور ابن زید کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

﴿عن ابن عباس وقتادة وابن زيد: ولايدخل في هذا اختلاف الفاظ القرأت والفاظ الامثال و الدلات ومقادير السور والايات، وانما اراد اختلاف التناقض والتفاوت، وقيل : المعنى لو كان ماتخبرون به من عند غير الله لاختلف ☆تفسير القرطبی سورة النساء﴾

پس معلوم ہوا کہ اختلاف کا مطلب یہ ہے ایک جگہ کسی بات کا اثبات ہو اور دوسری جگہ اسی بات کی نفی کی جائے اور قرآن میں ایسا کہیں بھی نہیں ہے یعنی اگر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہوتا جیسا کہ کفار کا خیال تھا، تو اسکے بیان کردہ مضامین اور واقعات میں تعارض وتناقص ہوتا کیونکہ ایک تو یہ کوئی چھوٹی کتاب نہیں ہے، ایک ضخیم اور مفصل کتاب ہے جس کا ہر حصہ فصاحت و بلاغت میں ممتاز ہے حالانکہ انسان کی بنائی ہوئی بڑی تصنیف میں زبان کا معیار اور فصاحت اور بلاغت قائم نہیں رہتی، دوسرے اس میں پچھلی قوموں کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جنہیں اللہ علام الغیوب کے سوا کوئی بیان نہیں کرسکتا، تیسرے ان قصص وحکایات میں کوئی تضاد ہے اور نہ ان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزو قرآن کے کسی اصل سے ٹکراتا ہے، حالانکہ انسان اگر گذشتہ واقعات بیان کرے تو تسلسل کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور انکی تفصیلات میں تعارض وتضاد واقع ہوجاتا ہے، چناچہ پرویز صاحب نے جن دو آیات کو اختلاف کے ضمن میں پیش کیا ہے کہ ''ایک جگہ تو وہ یہ کہہ دے کہ جس کا جی چاہے سیدھی راہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے گمراہ ہوجائے اور دوسری جگہ کہہ دے کہ تم اپنی مرضی سے کوئی راستہ اختیار نہیں کرسکتے ہم جسے چاہیں صحیح راستے پر لگادیں اور جسے چاہیں گمراہ کردیں'' اس پر تعارض اور تضاد کا اطلاق صحیح نہیں کیونکہ ہم وضاحت کرچکے ہیں کہ گمراہی کی نسبت بالاطلاق اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا جائز نہیں اور اردو تراجم میں جو لفظ گمراہی استعمال ہوا ہے اسکی اصلاح چاہیے یعنی وہاں گمراہ کرنے سے مراد گمراہی کا حکم لگانا ہے یا ہدایت سے محروم کردینا ہے یہی دو معنی ایسی آیات کے صحیح ہیں باقی اللہ تعالیٰ کو گمراہ کرنے والا کہنا علی الاطلاق جائز نہیں نیز اگر قرآنی آیات کے معنی ومفہوم میں نظر آئے تو غور وتدبر اور قرآنی آیات کے باہم تقابل سے اس اختلاف کو باآسانی رفع کیا جاسکتا ہے اسی لئے اس آیت کریمہ

میں تضاد اور اختلاف تلاش کرنے کے چیلنج سے قبل تدبر فی القرآن کی شرط عائد کی گئی ہے یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی کوئی بھی دو آیات جن میں بظاہر کوئی تضاد محسوس ہوتا ہو ان کا حل بھی قرآن ہی میں مضمر ہے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان تلاش کرے اس طرح اس اختلاف کو باآسانی رفع کیا جاسکتا ہے اور دونوں آیت میں باہم تطبیق یقینی طور پر کی جاسکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تدبر فی القرآن صحیح نہج پر کیا جائے اس ضمن میں اولاً پرویز صاحب کا طریقہ ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ:

﴿تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں دو اہم نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہے، ایک تو یہ کہ قرآن کی کسی ایک آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مضمون کی جتنی آیات قرآن میں جابجا بکھری پڑی ہوں ان سب کو سامنے رکھا جائے اسطرح قرآن کا صحیح مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تصریف آیات سے اپنا مفہوم واضح کرتا ہے یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے، قرآن فہمی کے لئے یہ شرط لاینفک ہے، اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم صحیح نہیں سمجھا جاسکتا جو اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہو مثلاً قرآن کی مجموعی تعلیم یہ ہے کہ خدا وحدہ لاشریک ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کو الخالق کہا گیا ہے اور دوسری جگہ اسے احسن الخالقین کہا گیا ہے یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حسین اور متوازن تخلیق کرنے والا، اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن خدا کے علاوہ اور بھی خالق تسلیم کرتا ہے جبھی تو اس نے اسے خالقین میں احسن قرار دیا ہے اس سے نظر بظاہر شرک کا پہلو متبادر ہوتا ہے، یہ تضاد قرآن کریم کی دیگر آیات کو سامنے لانے سے رفع ہوجاتا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۱۹۲﴾

پرویز صاحب کے مطابق '' آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مضمون کی جتنی آیات قرآن میں جابجا بکھری پڑی ہوں ان سب کو سامنے رکھا جائے''، لیکن اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیات کو سامنے کس بنیاد پر سامنے رکھا جائے مثلاً اگر ایک مضمون دس آیات میں آرہا ہے اور دوسرا مضمون گیارہ آیات میں آرہا ہے تو کیا دس آیات میں آنے والے مضمون کو رد کر کے گیارہ آیات میں آنے والے مضمون کو اختیار کیا

جائیگا؟ ظاہر ہے نہیں بلکہ تدبر فی القرآن کا مطلب یہ ہے کہ ایک مضمون والی تمام آیات کو جمع کر کے ان کے شان نزول، زمانہ نزول، آیات کے مخاطبین، موضوع بحث اور ناسخ ومنسوخ کو معلوم کیا جائے گا اسکے بعد باہم متعارض مضامین والی آیات میں تطبیق کی جائے گی اسی کو تدبر فی القرآن کہتے ہیں لیکن پرویز صاحب ان میں سے اکثر عوامل کو مطلق قابل اعتناء نہیں گردانتے کیونکہ ان تمام کا انحصار احادیث پر ہے جن سے پرویز صاحب کو الرجی ہے اسلئے پرویز صاحب نے تدبر فی القرآن کے ضمن میں دوسرا نکتہ یہ بیان کیا کہ ''قرآن کریم کی کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم صحیح نہیں سمجھا جاسکتا جو اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہو'' اور اس ضمن میں پرویز صاحب نے جو ''احسن الخالقین'' والی مثال پیش کی ہے وہ بھی غلط ہے بلکہ ایک دوسرے مقام پر خود پرویز صاحب نے ہی اسکا رد کیا ہے اور جس سے بقول پرویز صاحب ''شرک متبادر ہوتا ہے'' اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

﴿جہاں تک اشیائے کائنات کو پہلی بار بغیر کسی مسالہ کے بنانے کا تعلق ہے وہ خدا کے عالم امر سے متعلق ہے اور اس میں خدا کا کوئی شریک نہیں لیکن اسی طرح پیدا شدہ اشیاء کے باہمی امتزاج سے نئی نئی چیزوں کے تخلیق انسان بھی کرسکتا ہے اور کرتا ہے اسی لئے قرآن میں خدا نے اسے احسن الخالقین کہا ہے ☆ کتاب التقدیر ص ۳۶﴾

پس توحید اللہ تبارک وتعالیٰ کو صرف ربوبیت اور الوہیت میں مطلق اور دیگر صفات میں بعض اضافی شرائط کے ساتھ تسلیم کرنے کا نام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بیشتر صفات انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ السمیع ہے اور انسان بھی سمیع ہے، اللہ تعالیٰ البصیر ہے انسان بھی بصیر ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ الخالق ہے اور انسان بھی کچھ چیزیں تخلیق کرتا ہے لیکن ان تمام صفات کے استعمال میں انسان پر کچھ حدود وقیود ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ تمام صفات مطلق ہیں اس لئے جب یہ صفات اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوں تو یہ صفات دائمی اور قدیمی ہوں گی لیکن جب انسان کی طرف منسوب ہوں گی تو انسان کے مقام اور شان کے مطابق ہوں گی یعنی ایک حادث مخلوق کے اعتبار سے انسان پر ان صفات کا اطلاق ہوگا البتہ توحید کے منافی پرویز صاحب کا خودساختہ نظام ربوبیت کا نظریہ ضرور ہے جس کے تحت پرویز صاحب انسانوں میں صفت

ربوبیت پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں نیز پرویز صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ ’’قرآن کریم کی کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم صحیح نہیں سمجھا جا سکتا جو اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہو‘‘ تو وہ کس قرآن کی بات کرتے ہیں کیا اس مفہوم القرآن کی جسمیں کسی نبی کے کسی معجزہ کو تسلیم نہیں کیا گیا اور انبیاء کرام میں سے کم از کم ایک نبی آدم علیہ السلام کو تسلیم کرنے سے صریح انکار کیا گیا اور فرشتوں کے وجود کا انکار کیا گیا، ابلیس کا انکار کیا گیا، جنت اور دوزخ اور آخرت کو اسی دنیا میں کھینچ لایا گیا اور شعار اسلام مثلاً نماز، زکواۃ، حج اور قربانی کے عمل کو وقت اور پیسے کا زیاں قرار دیا گیا اب اگر ایسے آدمی کو تقدیر کا مسئلہ بھی قرآن کی مجموعی تعلیم کے خلاف نظر آتا ہو تو اس میں ہمارے نزدیک عجیب بات کوئی نہیں ہے۔

تقدیر کا معنی از پرویز صاحب:

پرویز صاحب لغات القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

﴿ اور ’’جاء علی قدر‘‘ کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا اور ’’قدر۔ ق کے زیر کے ساتھ‘‘ ہانڈی یا دیگ کو کہتے ہیں اسکی جمع قدور ہے اور ’’قدیر‘‘ اس گوشت کو کہتے ہیں جو مناسب مسالوں کے ساتھ ہانڈی میں پکایا جائے۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ قدر اور تقدیر کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ یا کسی چیز کو اندازے اور پیمانے کے مطابق بنا دینا نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا، متوازن اور معتدل رہنا، ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے، چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو اسلئے قدر کے معنی کسی چیز پر اقتدار و اختیار رکھنے کے بھی ہیں ☆ لغات القرآن ص ۱۳۳۳ ج ۳ ﴾

پرویز صاحب نے جو قدر اور تقدیر کا معنی کیا ہے اس اعتبار سے تقدیر پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لئے واجب اور ضروری ہوا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا ایک لازمی جزو اور حصہ ہوا یعنی تقدیر پر ایمان لانا

اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان لانا ہوا اور تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب اس بات پر ایمان لانا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو مکمل طور پر ناپ تول کر اور صحیح اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے چنانچہ لازمی طور پر وہ کائنات کی ہر صفت یعنی لمبائی، چوڑائی، ضخامت، جسامت، کمیت اور مقدار وغیرہ کو بخوبی جانتا ہے اور اسے کائنات کی ابتداء اور انتہا کے بارے میں بھی مکمل علم ہے یعنی کائنات کے خالق ہونے کے اعتبار سے اللہ تبارک وتعالیٰ کائنات کے ہر جزو اور حصہ سے مکمل طور پر باخبر ہے اور اس بات سے بھی باخبر ہے کہ کائنات کا کونسا پرزہ کس کام کے لئے بنایا ہے اور اس پرزہ کے کام کرنے کی مدت یا عمر کتنی ہے اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ علام الغیوب بھی ہوا یعنی وہ کائنات کے پیدا کرنے سے قبل ہی ازل سے کائنات کے کوائف اور حالات سے کلی طور پر باخبر تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿ ماا صاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتا کم ☆ سورۃ الحدید آیت ۲۲،۲۳﴾

یعنی ''کوئی مصیبت دنیا میں نہیں آتی اور نہ تمہاری اپنی جانوں پر مگر اس سے قبل کہ ہم اسے ظاہر کریں وہ کھلی کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے (یہ اس لئے تمہیں بتایا جارہا ہے) تاکہ جو کوئی چیز تم سے چھوٹ جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو کوئی چیز تم کو حاصل ہوجائے اس پر فخر نہ کرو' اس آیت کریمہ میں لفظ ''ان نبرأھا'' آیا ہے جس کے معنی ہیں ''قبل اسکے کہ ہم اسکو ظاہر کریں'' یعنی کوئی بھی مصیبت نازل ہونے، ظاہر ہونے اور اترنے سے قبل ہی کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور نہ کسی چیز کے حاصل ہونے پر خوشی میں آپے سے باہر ہوجاؤ اور سمجھنے لگو کہ وہ تمہاری محنت کا پھل ہے اور نہ کسی چیز کے کھوجانے پر افسوس کرو کیونکہ وہ تمہارے نصیب میں نہیں تھی بلکہ یہ یقین رکھو کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

کیا انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت سے خارج ہے؟:

پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ:

﴿تقدیر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش،ی،ا) میں مشیت کے معنی میں دیکھئے، وہاں لکھا ہے کہ گوشہ اول وہ ہے جہاں امر الٰہی کے مطابق ہر شئے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد وضوابط، قوانین اور خواص متعین ہوتے ہیں یہی قواعد وضوابط اور خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں ان ہی کو ان کی تقدیریں کہا جاتا ہے آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے، پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے اور نشیب کی طرف بہتا ہے اور ایک خاص درجہ حرارت تک پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے اور اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو سخت ہو کر پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے سورۃ فرقان میں ہے کہ:

﴿وخلق کل شئی فقدرہ تقدیرا ☆۲﴾

یعنی ''اللہ نے ہر شئی کو پیدا کیا پھر ان کیلئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیئے، راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الٰہی (یعنی پیمانوں کی) دو شکلیں ہیں ایک تو یہ کہ شئی کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ کہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا چاہے جیسے کہ سماوات اور دوسری یہ کہ کسی شئی میں کچھ بننے کی صلاحیت رکھدی جائے اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل کو پہنچ جائے اور وہ اسکے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی جیسے کہ بیج میں درخت بننے کی صلاحیت ہی اسکی تقدیر ہے ☆ لغات القرآن ص ۱۳۳۴، ۱۳۳۵ ج ۳﴾

پرویز صاحب نے یہاں اشیاء کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں ہم بھی ان سے اتفاق کرتے ہیں البتہ ہم اس اصول کا اطلاق صرف اشیاء پر نہیں بلکہ انسانوں پر بھی کریں گے کیونکہ انسان وجنات اللہ تعالیٰ کی مشیت سے خارج نہیں ہیں اسطرح ان دو قسموں میں سے پہلی قسم سے وہ کفار تعلق رکھتے ہیں جو صرف کفر کیلئے پیدا کئے گئے وہ اول سے ہی اپنے اصل پر رہتے ہیں یعنی عقیدہ کفر پر اور تادم مرگ اس عقیدے و عمل سے نہیں ہٹتے اسی طرح اس قسم سے وہ مسلمان بھی ہیں جو اپنی پیدائش سے لیکر تادم مرگ مسلمان رہتے ہیں جبکہ مذکورہ تقدیر کی دوسری قسم سے وہ لوگ تعلق رکھتے ہیں جو اپنی عمر کے اول میں مسلمان رہتے ہیں اور آخر میں موت سے قبل

کفر کو اختیار کر لیتے ہیں یا وہ غیر مسلم ہیں جو اپنی ابتداء میں کافر ہوتے ہیں مگر موت سے قبل مسلمان ہو جاتے ہیں اس طرح وہ اپنی اصل فطرت پر لوٹ جاتے ہیں اسی چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا کہ:

﴿ وکان من الکافرین ☆ سورۃ البقرۃ ۳۴ ﴾

یعنی ''وہ (ابلیس) کافروں میں سے تھا'' یعنی ابلیس اللہ تعالیٰ کے علم میں اپنی تقدیر کے اعتبار سے آدم کو سجدہ سے انکار کرنے سے قبل بھی کافروں میں سے تھا اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ محمد بن حسن ابوبکر بن فورک نے کہا کہ یہاں لفظ ''کان'' اپنے اصلی معنی یعنی ماضی کے معنی میں آیا ہے اور جن لوگوں کے نے کہا کہ یہاں کان ''صار'' کے معنی میں ہے انکی بات غلط ہے جو لوگ اس آیت میں کان کو صار کے معنی میں لیتے ہیں وہ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ''وہ (ابلیس) کافروں میں سے ہو گیا'' یعنی اس واقعہ سے قبل وہ کافروں میں سے نہیں تھا اور مشہور مفسر قرآن محمد بن احمد الانصاری القرطبی المتوفی ۱۷۶ھ ہجری نے بھی اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ یہاں ''کان'' اپنے اصلی معنی میں ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہی کافر تھا اسی مفہوم کی تائید ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ لم یکن من الساجدین ☆سورۃ الاعراف ۱۱ ﴾

یعنی ''ہمارے علم میں وہ اس سجدہ کا نہ کرنے والا پہلے سے ہی تھا'' اس لئے اس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا اور چونکہ سجدہ کے فعل کا سبب اللہ تعالیٰ تھا اس لئے اغویتنی کے ظاہر لفظ کی نسبت اسکی طرف کر دی گئی ورنہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا جو ابلیس کے لئے گمراہی کا فعل ہو۔

ہدایت اور ضلالت فطرت اور تقدیر پر منحصر ہے:

اسی چیز کا اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں بھی بیان فرمایا ہے ارشاد ہوا کہ:

﴿ فاقم وجھک للدین حنیفا،فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون ☆الروم ۳۰ ﴾

امام اسحاق بن راھویہ ؒ المتوفی ۲۳۸ھ ہجری نے کہا ہے کہ اس آیت میں لفظ ''حنیفا'' پر وقف کرنا چاہیے اور آگے آنے والے لفظ ''فطرت اللہ'' سے علیحدہ کرکے پڑھنا چاہیے اس صورت میں آیت کا یہ معنی ہوگا کہ ''دین حنیف کیلئے اپنے چہرے کو سیدھا کرلے، پیدا کیا اللہ نے لوگوں کو پیدا کرنا فطرت پر ایسی فطرت جس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں'' یہاں فطرت سے مراد وہ حالت ہے جس پر وہ پیدا کیا جاتا ہے یعنی اس کا نیک بخت اور بدبخت ہونا پھر اس حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی یعنی اگر ایک انسان بدبخت اور کافر پیدا کیا گیا ہو اور وہ بظاہر مسلمان نظر آتا ہو تو وہ لازمی طور پر موت سے قبل اپنی اصلی فطرت کی طرف لوٹ جائے گا اور کافر ہوکر ہی مرے گا جیسا کہ ابلیس شیطان کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے اسی مضمون کی وضاحت ایک دوسری آیت میں اس انداز سے کی گئی ہے کہ:

﴿ کما بدأ کم تعودون ☆ فریقا ھدی و فریقا حق علیھم الضلالۃ ☆ سورۃ الاعراف ۲۹،۳۰ ﴾

یعنی ''جس حالت پر اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے تم اس حالت کی طرف لوٹ جاؤ گے، ایک فریق ہدایت کی طرف اور دوسرا فریق جس پر ضلالت چسپاں ہوچکی ہے'' یعنی جو لوگ نیک بخت پیدا کئے گئے ہیں وہ موت سے قبل ہدایت کی طرف آجائیں گے اگرچہ زندگی بھر بدبخت اور کافر ہی کیوں نہ رہے ہوں اور اگر بدبخت پیدا کئے گئے ہیں تو موت سے قبل اس تقدیر کے طرف لوٹ جائیں گے اگرچہ زندگی بھر مسلمان رہے ہوں اور نیکی کے کام بھی کیوں نہ کرتے رہے ہوں محمد بن کعب قرظی نے اس کی یہی تفسیر کی ہے اور عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت بھی اسی کی تائید کرتی ہے اس آیت کی قرأت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک اس طرح ہے کہ:

﴿ کما بدأ کم تعودون فریقین ☆ فریقا ھدی و فریقا حق علیم الضلالۃ ☆ تفسیر قرطبی ۱۸۸ ج۷ ﴾

یعنی ''تم دو گرہوں میں بٹ جاؤ گے ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی ہے وہ ہدایت پر رہے گا اور دوسرے گروہ پر گمراہی ثبت کردی گئی ہے وہ گمراہی پر ہی مرے گا'' اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی نسبت اپنی طرف کی ہے یعنی ہدایت یافتہ جماعت کو ہدایت از خود حاصل نہیں ہوگی بلکہ وہ ہدایت اللہ تعالیٰ

کی عطا کردہ ہوگی اسی لئے نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہوئے نمازی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ ''اھد نا الصراط المستقیم، یا اللہ ہم کو سیدھی راہ دکھا کر اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما'' اسی چیز کو ایک سورۃ الاعراف آیت نمبر ۴۳ میں اس طرح ارشاد فرمایا کہ:

﴿ وقالوا الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ ﴾

یعنی جنتی لوگ کہیں گے کہ ''اللہ ہی کی تعریف ہے جس نے ہم کو ہدایت عطا کی اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی ہدایت نہیں پا سکتے تھے'' اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ رعد آیت ۳۱ میں فرمایا کہ:

﴿ أفلم یایئس الذین آمنوا ان لویشاء اللہ لھدی الناس جمیعا ﴾

یعنی '' کیا ایمان والوں کو اس بات پر دل جمعی نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دیدیتا'' اس آیت کے ضمن میں پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ:

﴿ یہاں ''أفلم یئس الذین آمنوا'' دراصل ''أفلم یعلم'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی کیا انھوں نے اس بات کو جان نہیں لیا ☆ لغات القرآن ص ۱۷۸۲ ج ۴ ﴾

پرویز صاحب نے یہاں پوری آیت کا ترجمہ نہیں کیا کیونکہ یہ انکے عقیدہ کیلئے تباہ کن ہوتا البتہ اس آیت کا تحریف شدہ ترجمہ جو مفہوم القرآن میں لکھا ہے وہ اس طرح ہے کہ:

﴿ کیا تمہاری جماعت کے لوگ اب بھی اس بات کو نہیں سمجھے کہ اگر لوگوں کو زبردستی مؤمن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے یہ کچھ بھی مشکل نہ ہوتا ☆ مفہوم القرآن ص ۵۶۰ ﴾

یہاں اس آیت میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جس کا ترجمہ ''زبردستی'' کیا جاسکے لیکن مفہوم بیان کرنے کی آڑ لے کر پرویز صاحب اس قسم کی تحریفات بغیر کسی ہچکچاہٹ اکثر آیات میں سینہ زوری کے ساتھ کرتے جاتے ہیں لیکن اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر بیان کیا ہے مثلاً سورۃ رعد آیت ۹ میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿ وعلی اللہ قصد السبیل ومنھما جائر ولو شاء لھدا کم اجمعین ﴾

یعنی ''ٹھیک، سیدھی اور مستقیم راہ کو واضح کرنا اللہ ہی کے ذمہ ہے اور ان راہوں میں سے ٹیڑھی راہ بھی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا'' اسی طرح سورۃ انعام آیت ۱۴۹ میں ارشاد ہوا کہ:

﴿ قل فللہ الحجۃ البالغۃ فلوشاء لھدا کم اجمعین ﴾

یعنی ”کہد یجئے اللہ ہی کے لئے قوی حجت ہے پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت یافتہ کر دیتا“ اور سورۃ عراف آیت ۱۷۸ میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

﴿ من یھد اللہ فھوا المھتدی ومن یضلل فاولئک ھم الخسٰرون ﴾

یعنی ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت پا سکتا ہے اور جنہیں اللہ ہدایت سے محروم کر دے تو وہی نقصان والے ہیں“ یعنی ہدایت اور گمراہی کا دارمدار تقدیر پر ہے۔

کیا تقدیر پر ایمان قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟:

پرویز صاحب تقدیر کا انکار کرتے ہوئے عقلی دلیل نقل فرماتے ہیں کہ:

﴿ جو سوالات بلکہ یوں کہئے اعتراضات بیشتر نوجوان طبقہ کی جانب سے موصول ہوئے ان کا مخلص یہ تھا کہ جو مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہو کہ انسان کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہ مٹ سکتا ہے اور نہ اسکے خلاف کچھ ہوسکتا ہے اس مذہب کو لیکر ہم مصارف زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کیا کر سکتے ہیں ☆ کتاب التقدیر ص ۲۳ ﴾

پرویز صاحب نے یہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کا جو تقدیر پر ایمان ہے اس کے اعتبار سے دوسری قوموں کا ترقی وتمدن وحضارت میں مقابلہ مسلمان نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ جو تمہارے مقدر میں لکھا جا چکا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا اس لئے عمل ومحنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے پرویز صاحب چونکہ منکرین حدیث میں شمار ہوتے ہیں اسلئے انھوں نے یہاں جس مذہب کا انکار کیا ہے وہ درحقیقت احادیث نبویہ پر ایمان رکھنے والوں کا مذہب ہے یہاں پرویز صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ احادیث نبویہ میں عمل ومحنت کو بے کار اور بے فائدہ بتایا گیا ہے یعنی ان کی عقل کے مطابق جب احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی قسمت میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ نہ مٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے تو پھر عمل ومحنت کا کوئی فائدہ نہیں ہے حالانکہ پرویز صاحب کا احادیث پر ایمان رکھنے والوں کی طرف یہ نسبت غلط

ہے کیونکہ احادیث میں تقدیر پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ عمل اور محنت کا بھی حکم دیا گیا ہے یعنی ہر شخص کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی تقدیر کو ڈھونڈے اور اپنی قسمت و مقدر کو تلاش کرے اور محض تقدیر پر بھروسہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار نہ بیٹھا رہے اس بات کے ثبوت میں صحیح بخاری و مسلم کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:

﴿عن علیؓ قال قال رسول اللہ ﷺ مامنکم من احد الا وقد کتب مقعده من النار و مقعده من الجنة ،قالوا یارسول اللہ ﷺ افلا نتکل علی کتابنا وندع العمل قال اعملوا فکل میسر لما خلق له اما من کان اهل السعادة فیسصیر لعمل السعادة و اما من کان من اهل االشقاوة فیسصیر لعمل الشقاوة ثم قرأ، من أعطی و اتقی و صدق بالحسنیٰ ☆ متفق علیه﴾

یعنی ”علیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم سے ہر شخص کی جگہ جنت یا جہنم میں لکھی ہوئی ہے، صحابہ کرام نے فرمایا کہ پھر ہم اپنے تقدیر کے لکھے پر بھروسہ نہ کریں اور عمل چھوڑ دیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عمل کرو ہر ایک کے لئے وہی راہ آسان ہوگی جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے جو شخص نیک بخت ہے اس کے لئے نیکی آسان ہوگی اور جو بد بخت ہے اس کے لئے برے عمل آسان ہوں گے پھر آپ ﷺ نے سورۃ اللیل کی یہ آیت تلاوت فرمائی کہ جس شخص نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور پرہیزگار رہا اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہا تو ہم بھی اسکو آسان راستے کی سہولت دیتے رہیں گے لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پرواہی برتی اور نیک بات کی تکذیب کی تو ہم بھی اسکی تنگی اور مشکل کا سامان میسر کر دیں گے یعنی اس کے لئے شر کا راستہ آسان کر دیا جائے گا“ اس حدیث میں تقدیر پر ایمان لانے کے ساتھ نیک عمل کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کو اسی راستے پر چلنے کی توفیق ملے گی جو اس کا مقدر ہوگا اور پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ مذہب یعنی تقدیر پر ایمان عمل سے روک دیتا ہے غلط ہے اور یہ اس لئے بھی غلط ہے کہ جب کسی انسان کو معلوم ہی نہیں کہ اسکی تقدیر میں کیا ہے تو وہ کیسے یہ یقین کر کے بیٹھ جائے گا کہ میرا مقدر خراب ہے خواہ میں عمل کروں یا نہ کروں میرا مقدر تبدیل نہیں ہوسکتا اور جب قرآن کی آیات اور احادیث نبوی یہ بتاتی ہیں کہ بعض لوگوں کا مقدر خراب لکھا گیا ہے اور بعض لوگوں کا اچھا تو کسی انسان کو یہ کس طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ

چونکہ اس کا مقدر خراب ہے اس لئے اس کو عمل کی ضرورت نہیں بلکہ تقدیر پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی کسی بھی کوشش وسعی کے رائیگاں ہوجانے کا غم نہیں کرتا اور کف افسوس ملتے رہنے میں وقت برباد نہیں کرتا بلکہ اس نقصان کو اپنی تقدیر کا لکھا سمجھکر صبر کرتا ہے اور جو تقدیر کا لکھا اسے مل جاتا ہے اسی پر قناعت کرتا ہے اور جب انسان یہ بھی سنتا اور پڑھتا ہے کہ ہر انسان کو اسکے مقدر کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدد اور توفیق عطا ہوتی ہے اور عمل شروع کرنے سے اسکے مقدر کی راہ آسان ہوجاتی ہے تو وہ مزید شوق اور لگن کے ساتھ اپنے عمل کو شروع کرتا ہے یعنی تقدیر پر ایمان انسان کو عمل سے روکتا نہیں بلکہ اس کے اندر مزید شوق اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

مسئلہ تقدیر پر ایمان اور صحابہ کرام کا عمل:

جب صحابہ کرام نے تقدیر کی آیات واحادیث سنیں تو ان کے اندر عمل کا نیا ولولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوگیا اس بارے میں یہ حدیث ملاحظہ ہو:

﴿عن ابن عباسؓ قال رجل یا رسول اللہ ﷺ أنعمل فیماجرت به المقادیروجف به القلم او شئی نأتنفه قال بل بما جرت به المقادیر و جف به القلم قال ففیم العمل قال اعمل فکل میسر لما خلق له☆ رواه الطبرانی والبزار☆ بنحوه الا انه قال فی آخره ، فقال القوم بعضهم لبعض فالجد اذاً ☆ مجمع الزوائد ص ۴۰۰ ج۷﴾

یعنی ''ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ہم تقدیر کے موافق عمل کرتے ہیں یا بغیر تقدیر اور بغیر لکھے عمل کو سرانجام دیتے ہیں اور اسکی اپنی طرف سے ابتدا کرتے ہیں کیا اللہ کے یہاں پہلے سے اس عمل کا ذکر یا ریکارڈ نہیں ہے آپ ﷺ نے فرمایا تم اللہ کے لکھے اور پہلے سے ریکارڈ پر موجود عمل کو ہی کرتے ہو یہ طبرانی کی روایت ہے اور اسکو بزار نے بھی روایت کیا ہے اسکے آخر میں ہے کہ صحابہ کرام نے یہ سن کر ایک دوسرے سے کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اعمال کو مزید کوشش

کر کے کرنا چاہیئے''اوراسی مضمون کی ایک دوسری روایت اسطرح ہے کہ:

﴿عن سراقة بن مالك بن جعشم ؓ انه قال يارسول الله ﷺ انعمل شيئا قد فرغ منه ام نستانف العمل قال بل العمل قد فرغ منه فقال يارسول الله ﷺ فغيم العمل .فقال النبی ﷺ كل ميسر له عمله قال يارسول الله ﷺ الآن الجد الآن الجد ☆ رواه الطبرانی.مجمع الزوائد ص ۱ ۰ ۴﴾

یعنی''سراقہ بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ ہم جو عمل کرتے ہیں ان اعمال کو ہمارے کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس لکھ کر ان سے فراغت حاصل کر لی ہے یا ہم ان اعمال کی اپنی طرف سے ابتدا کرتے ہیں،اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ لکھا ہے نہ ہمارے کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ان اعمال کو لوگوں کے کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس لکھ کر ان سے فراغت حاصل کر لی ہے،سراقہ ؓ نے کہا یارسول اللہ پھر ہمیں ان اعمال کے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہر شخص کے لئے اسکے عمل کو آسان کر دیا گیا ہے جو اس پر لکھا گیا ہے،سراقہ ؓ نے کہا یارسول اللہ ﷺ پھر تو ہم ہر عمل کو سخت محنت اور لگن سے کیا کریں گے،اور سراقہ ؓ نے یہ بات دو بار کہی''اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا اور حافظ ہیثمی ؒ نے مجمع الزوائد میں کہا کہ اسکے تمام روای صحیح کے راوی ہیں۔

امام ابن قیم ؒ نے اس حدیث کی شرح وتفسیر میں کہا ہے کہ اس واقعہ سے صحابہ کرام کی فقاہت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دین اسلام کے امور کی کتنی سمجھ رکھتے تھے،جب ان صحابہ کرام کو تقدیر کی احادیث سے معلوم ہوا کہ مقاصد کے حصول کو اللہ تعالیٰ نے اسباب سے جوڑ رکھا ہے اور ہر مقصد جس سبب سے تعلق رکھتا ہے اس مقصد کا حصول اس سبب کے حصول اور وجود پر موقوف ہوتا ہے پس انسان اپنے اس مقصد کے حصول کیلئے اس سبب کو ڈھونڈ کر حاصل کرے گا اور اس سبب کے حصول کیلئے دن رات انتھک محنت کریگا تا کہ اسکے وجود وحصول سے اس کا مقصد حاصل ہو۔

مسئلہ تقدیر پر ایمان اور عمل کا باہمی تعلق:

تقدیر پر ایمان لانے کا ہرگز مقصد یہ نہیں کہ آدمی عمل سے بے نیاز ہو جائے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور جو شخص ایسا کرے تو ہم ایسے شخص کو مسئلہ تقدیر کا قائل نہیں بلکہ احمق اور ناسمجھ کہیں گے جبکہ مسئلہ تقدیر کا قائل اسے کہا جائے گا جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے بعد اپنی محنت کے پھل کے حصول کو یقینی نہ سمجھے بلکہ اسے اپنی تقدیر کے حوالے کردے جس طرح کسی انسان کے بڑے عالم بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے اور جو انسان جتنی محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کریگا اسقدر وہ بڑا عالم بن کر نکلے گا جبکہ وہ شخص جو محنت اور لگن سے تعلیم حاصل نہیں کرے گا وہ اس میدان میں پیچھے رہ جائے گا اسی طرح ایک انسان جب چاہے گا کہ اسکی اولاد ہو تو وہ اسکے سبب کے حصول کی کوشش کرے گا کیونکہ اسکو معلوم ہے کہ اسکے بغیر اسکے مقصد کا حصول ناممکن ہے اس کے لئے وہ نکاح کرے گا اور ازدواجی امور سرانجام دے گا لیکن کیا اسکے بعد وہ تقدیر سے بے نیاز ہو جائے گا اور اسے اولاد حاصل ہونے کی گارنٹی مل جائے گی؟ نہیں! بلکہ اسکے بعد اسے تقدیر پر بھروسہ کرنا پڑے گا اگر اسکی تقدیر میں اولاد کا وجود ہے تو یقیناً اسے اولاد حاصل ہوگی لیکن اگر اسکی تقدیر میں اولاد نہیں تو شادی کے باوجود بھی اسے اولاد حاصل نہیں ہوگی اسی طرح جو انسان زمین سے غلہ حاصل کرنا چاہے گا وہ اس غلے کے حصول کے لئے اسباب کی طرف توجہ دے گا مثلاً زمین میں ہل چلائے گا، بیج ڈالے گا اور کھیتی کو پانی پلائے گا لیکن اس کے باوجود اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اسے یقینی طور پر پھل حاصل ہو جائے گا بلکہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کی خاطر اسکی یہ ساری محنت اکارت کردے اس لئے محض سمجھنا کہ یہ اسباب ہی سب کچھ ہیں اور اسکے باہر کچھ بھی نہیں اور جو کوئی بھی ان اسباب کو اختیار کرے گا وہ اپنے مقصد کو یقینی طور پر حاصل کرلے گا تقدیر کا انکار ہے گویا تقدیر پر ایمان کا مقصد اور اسکا لب لباب یہ ہے کہ دنیا کے مقاصد و حاجات وضروریات کا حصول ان اسباب کے حصول پر موقوف ہے جن اسباب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان مقاصد کا حصول جوڑ رکھا ہے اور یہ اسباب بھی قضاو قدر میں لکھے ہوئے ہیں مثلاً دنیا میں آپ کو ایسے بہت سے لوگ مل جائیں گے جو تجرد کی زندگی گذارنا چاہتے تھے اور بیوی بچوں

کے جھنجٹ سے آزاد رہنا چاہیے تھے مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تقدیر میں اولاد لکھی تھی اس لئے کسی نہ کسی مجبوری کے سبب انھیں شادی کے بندھن میں بندھنا ہی پڑا یعنی مقاصد کا حصول اسباب واعمال سے متعلق ہے اور اسباب واعمال انسان کو اسی سمت لے جاتے ہیں جہاں اسکی تقدیر ہے اور جس طرح مقاصد دنیاوی اسباب سے متعلق ہیں جن کی تکمیل کے بغیر دنیاوی مقاصد کا حصول ناممکن ہے اسی طرح اخروی مقاصد بھی اسباب سے متعلق ہیں اور وہ اسباب اعمال صالحہ ہیں یعنی اخروی مقاصد اور دخول جنت اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی پر منحصر ہیں اور اعمال صالحہ کے بغیر ان چیزوں میں سے کسی کے حصول کی امید رکھنا اسی طرح ہے جیسے بغیر شادی کے بچے کی امید لگا بیٹھنا یہی وجہ ہے کہ جب صحابہ کرام کے شاگردوں میں سے ابوعثمان النھدیؒ نے تقدیر کی احادیث سنیں تو کہا کہ مجھے اس امر کے اول پر آخر کی نسبت زیادہ خوشی ہے یعنی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہی ہمارے اوپر ان اعمال کو لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان اعمال کو کرنے میں اس کی مدد و توفیق شامل حال رہے گی تو مجھے اس بات پر جو خوشی ہوئی وہ اس خوشی سے کہیں زیادہ ہے جو اپنے اعمال صالحہ کے کرنے پر مجھے ہوئی کیونکہ مجھے اس سے یہ یقین ہو گیا کہ یہ عمل میں نے اپنے زور بازو اور ذاتی قوت واختیار سے نہیں کیا بلکہ یہ عمل میرے لئے اس سبب آسان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو میرے لئے مقدر کر رکھا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ تقدیر پر ایمان اللہ تعالیٰ کی توحید اور انسان پر اسکی بے بہا نعمتوں پر یقین کا باعث ہے مثلاً ایک انسان ایک کام اپنے بل بوتے پر کرتا ہے اور ایک کام کسی اور کی توفیق و مدد سے کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ انسان اپنے بل بوتے پر کیے ہوئے کام پر کسی کا شکریہ ادا نہیں کرے گا اور جو کام اسکا کسی اور کی مدد و توفیق سے سرانجام پایا ہو وہ انسان اس کام کی تکمیل کا سہرا اپنے سر نہیں بلکہ اس انسان کے سر باندھے گا جس کی مدد و حمایت سے وہ کام مکمل ہوا ہے، قرآن کریم نے تقدیر کے مسئلہ کو واضح کرنے کیلئے متعدد مثالیں بیان فرمائی ہیں مثلاً قارون کا قصہ بیان کیا کہ جب اس سے کہا گیا کہ اپنی اس بے شمار دولت میں سے اللہ کی راہ میں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرے تو اس نے یہی جواب دیا کہ ''اوتیتہ علی علم عندی'' حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اسکا مطلب یہ نہیں کہ ''یہ میرے علم اور محنت کا کمایا ہوا ہے اور اللہ کا دیا ہوا نہیں'' بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ مال مجھے یہ سمجھکر دیا ہے کہ میں اسکا مستحق ہوں اور اللہ تعالیٰ

میرے اوپر راضی اور مجھ سے خوش ہے یعنی اللہ کے علم میں اگر میں اللہ کا محبوب بندہ نہ ہوتا تو وہ مجھے یہ مال کبھی نہ دیتا جس طرح اس نے بعض لوگوں کو اس لئے غریب رکھا ہے کہ اللہ ان سے ناراض ہے گویا قارون نے غربت اور تونگری کو اللہ کی رضا کا معیار قرار دیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اسکو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے بہت لوگوں کو ہلاک کرڈالا جو قوت و دولت کے اعتبار سے بہت مضبوط تھے'' اگر مال و دولت کی فراوانی اللہ کی رضا اور محبت کی علامت ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کبھی ہلاک نہ کرتا اس سے معلوم ہوا کہ قارون تقدیر کا منکر نہیں بلکہ تقدیر پر ایمان رکھتا تھا، اسی طرح سورۃ کہف میں دو آدمیوں کی مثال بیان کی گئی ہے جسمیں سے ایک مالدار تھا اور دوسرا تنگدست پھر جب مالدار آدمی سے کہا گیا کہ تم اپنے مال میں سے غربا و مساکین پر خرچ کرو تو اس نے بھی یہی کہا کہ یہ میری محنت کا نتیجہ ہے میں کیوں کسی پر یہ مال خرچ کروں حالانکہ اگر وہ اسے اپنی تقدیر کا لکھا ہوا سمجھتا تو اس تقدیر کے لکھے پر شکر ادا کرتا اور شکرانے کے طور پر اپنے مال میں سے ضرورت مندوں کا حصہ بھی ادا کرتا اسکے برخلاف وہ لوگ جن کا رزق اللہ تعالیٰ نے تنگ کردیا ہو وہ سرتوڑ کوشش کے باوجود بھی جب اپنی مرضی و منشا کے مطابق تونگری حاصل نہیں کرپاتے تو تقدیر پر ایمان نہ رکھنے کے باعث مایوسی کا شکار ہوجاتے ہیں اور آخر کار خودکشی جیسے بھیانک عمل کو بھی کرگذرتے ہیں اس لئے جو شخص تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ درحقیقت کسی اور کا کچھ نقصان نہیں کرتا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

اسی طرح اعمال صالحہ کا معاملہ ہے اگر یہ عمل انسان نے اپنے اختیار اور کسی بیرونی مدد کے بغیر کیا ہو تو وہ کسی کا شکریہ ادا نہیں کرے گا اور اس عمل پر کسی کا احسان مند نہیں ہوگا لیکن اگر وہ یہ سمجھے کہ یہ عمل نہ میرے بس میں تھا اور نہ میرے لئے ممکن بلکہ یہ تو رب تعالیٰ کی خصوصی توفیق اور مدد سے انجام پایا ہے تو وہ زندگی بھر رب تعالیٰ کا ممنون اور شکرگذار رہیگا اور قرآن وسنت میں اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ انبیاء کرام وصالحین اپنے اعمال صالحہ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ عمل بغیر کسی مدد کے میرے اختیار سے وجود میں آیا ہے۔

تقدیر کا لغوی اور شرعی معنی:

پرویز صاحب نے تقدیر کے معنی پیمانہ الٰہی کیا ہے جو کہ صحیح نہیں بلکہ تقدیر کا معنی ہے پیمانے سے چیزوں کا ناپنا کیونکہ لفظ تقدیر مصدر ہے اور کسی مصدر کا ترجمہ جب بھی اردو میں کیا جائے تو اسکے آخر میں ''نا'' آتا ہے جیسا کہ قتلٌ کے معنی ہیں قتل کرنا اور ضربٌ کا معنی ہے مارنا اسی طرح تقدیرٌ کا مطلب ''ناپ'' نہیں بلکہ ''ناپنا'' ہے اور ''قدر'' کا مطلب ''ناپا'' ہے، اس معنی کے لحاظ سے لفظ تقدیر کا مطلب ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کائنات کو ناپ تول کر پیدا کیا ہے اور جو شخص کسی چیز کو ناپ تول کر بناتا ہے یا لیتا اور دیتا ہے تو اسکو اس چیز کی مقدار و کمیت کا پورا پورا علم ہوتا ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اور حیوان کا رزق ناپ تول کر مقرر کر دیا ہے اب اس میں کمی بیشی ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کی عمر بھی ناپ و تول کر مقرر کر دی ہے جسمیں اضافہ یا کٹوتی ناممکن ہے البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود چاہے تو اس رزق یا عمر میں کمی بیشی کر سکتا ہے کیونکہ اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہے یہی بات ایک حدیث میں بھی مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿عن ابن مسعودؓ قال حدثنا رسول اللہ ﷺ وهو الصادق المصدوق. ان خلق احدكم يجمع فى بطن امه اربعين يوما نطفة ثم يكون علقة مثل ذالک ثم يكون مضغة مثل ذالک ثم يبعث الله اليه ملكا باربع كلمات، فيكتب عمله و اجله ورزقه وشقى او سعيد ثم ينفخ فيه الروح فوالذى لا اله غيره ان احدكم ليعمل بعمل اهل الجنة حتى مايكون بينه وبينها الاذراع فيسبق عليه الكتاب فيعمل بعمل اهل النار فيدخلها وان احدكم ليعمل بعمل اهل النار حتى مايكون بينه وبينها الاذراع فيسبق عليه الكتاب فيعمل بعمل اهل الجنة فيدخلها ☆ متفق عليه﴾

یعنی ''عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہم کو نبی کریم ﷺ نے یہ بات بیان کی اور آپ ﷺ سچے تھے

اور جو بات آپ کو بتائی جاتی تھی وہ بھی سچی ہوتی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے ہر انسان کی پیدائش اسطرح ہوتی ہے کہ ماں کے بطن میں چالیس دن تک نطفہ کی حالت میں رہتا ہے پھر اگلے چالیس دن خون کی حالت میں رہتا ہے پھر اگلے چالیس دن گوشت کے ٹکڑے کی حالت میں رہتا ہے اسکے بعد اللہ تعالیٰ اسکی جانب ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ فرشتہ آ کر اسکا عمل، اسکی عمر، اسکا رزق اور اسکا نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھتا ہے پھر اس میں روح پھونکتا ہے، اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ایک انسان جنتیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے اور عمل کرتے کرتے جنت کے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ اسکے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر وہ پلٹ کر جہنمیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے اور اسی پر مر کر جہنم میں چلا جاتا ہے جبکہ ایک انسان پوری زندگی جہنمیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم کے اتنے نزدیک ہو جاتا ہے اسکے اور جہنم کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر وہ پلٹ کر جنتیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے اور اسی پر اسکا خاتمہ ہوتا ہے اور وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے'' یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان پر آخر میں اللہ تعالیٰ کا لکھا ہوا غالب آ جاتا ہے پھر وہ وہی عمل کر کے مرتا ہے جو اسکا مقدر ہوتا ہے اور اللہ کے پاس لکھا ہوا محفوظ ہوتا ہے اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپ تول کر اسکا انجام لکھتا ہے جو کبھی غلط واقع نہیں ہوسکتا ہے اسکی مثال یہ ہے کہ ایک سائنس دان سورج کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سورج فلاں تاریخ کو اتنے بج کر اتنے منٹ پر اپنی روشنی کھودے گا اور گرہن ہو کر کالا ہو جائے گا اس سائنس دان کی خبر سو فیصد پوری اترتی ہے اور چمکتا دمکتا سورج جو پوری دنیا کو روشن کر رہا ہوتا ہے یکدم سیاہ ہو جاتا ہے لیکن اسی نوعیت کی بات جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی انسان کے بارے میں ارشاد کرے کہ وہ انسان اپنے آخری وقت میں اپنے پہلے دین و مذہب سے ہٹ کر دوسرا دین اختیار کر کے مرے گا تو دنیا کہنے لگتی ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے ہم اسکو ماننے کو تیار نہیں ہیں یعنی انسان اپنے جیسے انسان کے علم کی بنیاد پر کی گئی پیش گوئی کی تصدیق کرتا ہے جبکہ رب تعالیٰ کے علم کی بنیاد پر آنے والے انسانی حالات کے خبر کی تصدیق کرنے سے انکار کرتا ہے پس معلوم ہوا کہ لفظ تقدیر کے لغوی اور شرعی معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

کیا مسئلہ تقدیر میں قرآنی آیات باہم متصادم ہیں؟:

پرویز صاحب ''کتاب التقدیر'' میں صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں کہ:

﴿ اور جس طبقہ نے قرآن کریم کا مطالعہ شروع کردیا تھا ان کا اعتراض یہ تھا کہ ہمیں تو اس میں قدم قدم پر تضادات ملتے ہیں کہیں وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے ہدایت حاصل کرلے اور جس کا جی چاہے گمراہ ہوجائے ، اور کہیں کہتا ہے کہ ہدایت و گمراہی خدا کی طرف سے ملتی ہے انسان کا اسمیں کوئی اختیار نہیں ﴾

پرویز صاحب کی اس بات سے واضح طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں باہم تضاد اور اختلاف ہے جس کو پرویز صاحب نے اپنی کتاب التقدیر میں حل کیا ہے، پرویز صاحب کی یہ بات کہاں تک درست ہے یہ ہم قرآن سے پوچھتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿ أفلا يتدبرون القرآن ولو كان من عندغير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا ☆ سورة النساء آيت ٨٢ ﴾

یعنی ''کیا ان لوگوں نے قرآن میں غور نہیں کیا، اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو یہ لوگ اسمیں بہت اختلاف پاتے'' اس آیت کریمہ میں قرآن کے سچے ہونے کی دلیل اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں یہی بات اس حقیقت کے لئے کافی ہے کہ یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں قرآن کی اس وضاحت کے بعد پرویز صاحب نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے ان لوگوں کو قرآن میں اختلاف کیوں نظر آیا، ہمارے علم کے مطابق اسکی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی عربی دان مفسر کی تفسیر نہیں پڑھی حالانکہ قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی عربی دان مفسر سے قرآن کی تفسیر سمجھنا ضروری ہے اور اگر کوئی شخص عربی زبان کے قرآن کی تفسیر کسی عجمی شخص سے پڑھنا چاہے گا تو وہ قرآن کی صحیح تفسیر سے محروم رہے گا یہاں مخالفین کی جانب سے یہ اعتراض بھی وارد ہوسکتا ہے کہ قرآن کا اردو مفہوم یا تفسیر پرویز کے علاوہ دیگر بہت سے لوگوں نے بھی لکھی ہیں ایسی صورت میں ان تمام تفاسیر کو غلط قرار دیا جانا چاہیے جبکہ ایسا نہیں ہے اسکا جواب یہ ہے کہ پرویز کے علاوہ

جن اہل علم حضرات نے بھی قرآن کی تفاسیر اردو زبان میں لکھی ہیں ان سب نے عربی تفاسیر اوراحادیث نبوی سے استفادہ کرنے کے بعد ہی ان تفاسیر کورقم کیا ہے لہذا اصولی طور پر وہ اردو تفاسیر قرآن کی منشاء کے مطابق ہیں البتہ علم وتفہم کی بنیاد پر بعض اختلافات بھی ہیں،قرآن کریم کی عربی زبان میں بے انتہاء تفاسیر دستیاب ہیں اوران میں سے بعض تفسیروں کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے پرویز صاحب کواعتراض لکھ کر بھیجنے والے افراد اگران عربی تفاسیر کی طرف رجوع کرتے تو وہ قرآن میں کوئی اختلاف نہ پاتے اورقرآنی آیات پراعتراض روانہ کرنے والے غالباً وہی لوگ ہیں جو پرویز صاحب کے معتقدین ہیں اور پہلے سے ہی انکار حدیث کے فتنہ میں مبتلا ہیں یہ لوگ اگرقرآن کوقرآن پہنچانے والے کے بیان سے ہٹ کر اپنی طرف سے سمجھنے کی کوشش کریں گے تو گمراہی کے سوا کچھ نہیں پائیں گے،اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ قرآن نبی کریم ﷺ پر نازل فرمایااور ساتھ ہی سورۃ النحل میں یہ اعلان بھی کیا کہ:

﴿انزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم ولعلھم یتفکرون☆۴۴﴾

یعنی ’’اے محمد ﷺ یہ ذکر یعنی قرآن ہم نے آپکی طرف نازل کیا ہے،آپ ﷺ ہی اسکا مفہوم اور تشریح لوگوں کے لئے بیان کریں تاکہ لوگ اس میں غور فکر کریں‘‘اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کا مفہوم بیان کرنا نبی کا وظیفہ ہے جواقوال واعمال دونوں شکلوں میں ہوسکتا ہے اسکے علاوہ خودقرآن کی بعض آیات بھی بعض آیات کی تشریح کرتی ہیں چناچہ امت کے اہل علم کا وظیفہ یہ ہے کہ قرآن اور نبی کریم ﷺ کے بیان یاعمل جسے عرف عام میں حدیث کہا جاتا ہے کی باہم مطابقت کوسامنے لاتے ہوئے ایک مربوط انداز میں عوام کے سامنے پیش کریں جسے عرف عام میں تفسیر کہا جاتا ہے لیکن جوشخص صاحب قرآن کے کلام کو حجت تسلیم کرنے کوتیار نہ ہوتو اسے قرآن میں اختلاف کے سوااور کیا نظر آئے گا،قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں جوصحابہ کرام کوبھی ازخود سمجھ میں نہیں آسکیں بلکہ انھیں ان آیات کوسمجھنے کے لئے صاحب قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑا مثلاً حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر ابن کثیر میں مسند احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ صحابی رسول ﷺ عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سورۃ البقرۃ کی آیت:

﴿وکلوا وشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط

الاسود☆۱۸۷﴾

کے حکم کے مطابق ایک سیاہ دھاگہ اور ایک سفید دھاگہ رکھ لیا اور جب تک ان میں تمیز نہ ہوئی روزہ رکھنے کے لئے سحری کھاتا رہا پھر صبح کو اس بات کا تذکرہ نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے صبح کی سفیدی کا رات کی سیاہی سے ظاہر ہونا مراد ہے یعنی اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جب ایک صحابی جو اہل زبان ہے اور قرآن اسکی زبان میں نازل ہوا ہے اسے قرآن کے ظاہری الفاظ سے غلطی لگ سکتی ہے اور وہ قرآن کی مراد کے برخلاف مفہوم اخذ کرسکتا ہے تو پھر بعد میں آنے والے لوگ قرآن کو اسکے ظاہری الفاظ اور محض عربی لغت کی مدد سے کس طرح سمجھ سکتے ہیں پس ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر بالعموم اور مشکل آیات کا مفہوم بالخصوص صاحب قرآن نبی کریم ﷺ سے معلوم کرنا چاہیے جو آج ہمارے پاس آپ ﷺ کے اقوال و اعمال پر مشتمل صحیح احادیث کی صورت میں قطعی طور پر محفوظ ہے لیکن جو شخص یا جو فرقہ احادیث کے بارے میں شک کرتا ہو یا احادیث کا مطلقاً انکاری ہو وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر یا مفہوم متعین کرتے ہوئے لامحالہ اپنے ذاتی جذبات، محدود علم، معاشرتی دباؤ اور ناقص عقل کے دام میں گرفتار ہوگا اور منشاء الٰہی کے برخلاف قرآن کی تشریح اور مفہوم بیان کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکے گا یہی وجہ ہے بعض اہل علم نے یہاں تک کہا کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا کسی کی ذاتی رائے پر عمل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

منکرین حدیث بھی احادیث کے محتاج ہیں:

منکرین حدیث عبادات و مذہبی رسومات کے ضمن میں کلی طور پر حدیث کے محتاج ہیں مثلاً نماز، روزہ حج اور زکواۃ کی ادائیگی حدیث کو اپنائے بغیر ممکن ہی نہیں اسی طرح نکاح یا مردے کی تجہیز و تکفین وغیرہ بھی حدیث کی رہنمائی کے بغیر ناممکن ہے لیکن صرف یہی نہیں بلکہ حدیث کا انکار کرنے کے لئے بھی منکرین حدیث کو بالآخر حدیث ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے مثال کے طور پر منکرین حدیث اور انکے متبعین کہتے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے صرف قرآن کو حجت مانتے ہوئے کہا تھا کہ ''حسبنا کتاب اللہ'' یعنی ہم کو اللہ کی کتاب کافی ہے، اگر عمر فاروقؓ کا یہ قول پیش کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ عمر فاروقؓ کا یہ قول قرآن کی کونسی آیت

میں ہے تو وہ کہیں گے جی یہ قرآن میں نہیں ہے یہ تو حدیث میں ہے یعنی حدیث کا انکار کرنے والے حدیث کی حجیت سے انکار کرنے میں خود حدیث کے محتاج ہیں، منکرین حدیث یہ بھی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیثوں کے نہ لکھنے کا حکم دیا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کا یہ قول بھی ایک حدیث ہی ہے جس کو حدیث کے حجت نہ ہونے پر پیش کیا جاتا ہے، لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منکرین حدیث کے نزدیک جب حدیث سرے سے حجت ہی نہیں ہے تو منکرین حدیث انکار حدیث کے ثبوت میں احادیث کو پیش ہی کیوں کرتے ہیں۔

عمر فاروقؓ کے قول حسبنا کتاب اللہ کا مطلب:

اگر کوئی موحد اور متبع سنت سوال کرے کہ عمر فاروقؓ کے اس قول کا مطلب کیا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ عمر فاروقؓ نے قرآن نبی کریم ﷺ سے پڑھا تھا جس میں ہر آیت کا مفہوم نبی کریم ﷺ نے انھیں خود بتایا تھا یعنی عمر فاروقؓ کا اشارہ محض قرآن کے الفاظ کی طرف نہیں بلکہ اس سے مراد قرآن کے الفاظ اور انکا وہ مفہوم تھا جو نبی کریم ﷺ نے انھیں سکھایا تھا یعنی عمر فاروقؓ کے مذکورہ قول سے قرآن مفسر و مشرح بالحدیث مراد ہے یعنی [حسبنا کتاب اللہ] سے مراد صرف قرآن کریم مراد لینا بہت بڑی جہالت کی بات ہے کیونکہ سورۃ نحل کی آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ قرآنی آیات واحکامات کی شرح وتفسیر محمد رسول اللہ ﷺ کو سونپی گئی اور آپ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے پورے تیئس سال میں اس شرح وتفسیر کو مکمل کیا اسلئے حجۃ الوداع میں اعلان ہوا کہ:

﴿الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ☆سورۃ المائدہ﴾

یعنی ''آج تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا گیا اور نعمتوں کی تکمیل کر دی گئی'' قابل غور مقام ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل کرنے کی خبر دی ہے اور دین محض قرآن نہیں بلکہ قرآن کے علاوہ نبی کا قول اور عمل بھی دین ہے یعنی یہاں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے قرآن کی تفسیر کر کے دین کی تکمیل کر دی ہے اس اعتبار سے عمر فاورقؓ کے قول [حسبنا کتاب اللہ] میں قرآن کے ساتھ اسکی تفسیر از خود داخل ہے کیونکہ عمر فاروقؓ نے قرآن کو پرویز صاحب کی طرح لغت اور منطق کی مدد سے از خود نہیں سمجھا تھا بلکہ قرآن کی تفسیر وتشریح نبی کریم ﷺ سے باقاعدہ حاصل کی تھی اسی

چیز کو اصطلاح میں حدیث نبوی ﷺ کہا جاتا ہے نیز معلوم ہونا چاہیے کہ عمر فاروقؓ سمیت تمام صحابہ کرام کے لئے حدیث بذاتہ حجت تھی اسکی سب سے قوی دلیل وہ تاریخی حقیقت ہے جسمیں نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد انصار نے خلافت کے مسئلہ میں اختلاف کیا اور کہا کہ خلیفہ ہم میں سے ہوگا اس موقعہ پر ابوبکر صدیقؓ نے کسی قرآنی آیت کو پیش نہیں کیا بلکہ صرف ایک حدیث پیش کی اور فرمایا:

﴿ لقد علمتم ان رسول اللہ ﷺ قال . لوسلک الناس وادیا وسلکت الانصار وادیا سلکت وادی الانصار . ولقد علمت یاسعد ان رسول اللہ ﷺ قال وانت قاعد قریش ولاۃ ھذا الامر خبر الناس تبع لبرھم و فاجرھم تبع لفاجرھم فقال لہ سعد صدقت نحن الوزراء وانتم الامراء ☆ رواہ الامام احمد فی مسندہ . الفتح الربانی و البدایۃ والنھایۃ ص ٢٨٤،٢٨٥ ج٥ ﴾

یعنی ’’اے انصار کیا تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا، اگر لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری وادی میں چلیں تو میں انصار کے ساتھ چلوں گا اور اے سعد کیا تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ قریش اس امر کے والی ہیں، پس نیک آدمی نیک آدمی کا اور فاجر آدمی فاجر آدمی کا پیروکار ہے تو سعدؓ نے فرمایا آپ سچ فرماتے ہیں ہم وزراء ہیں اور آپ امراء ہیں‘ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر امت کا اتفاق قرآن کی کسی آیت کی بنا پر نہیں بلکہ صرف حدیث کی بنیاد پر ہوا نیز عمر فاروقؓ جن کا قول ’’حسبنا کتاب اللہ‘‘ ہے وہ بھی محض حدیث کی بنیاد پر ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اولین لوگوں میں شامل تھے اور انصار میں سے خلافت وامارت کے دعویدار سعد بن عبادہؓ اپنے دعویٰ سے دستبردار قرآن کی کسی آیت سے نہیں بلکہ ایک حدیث سن کر ہوئے مذید برآں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات تک قرآن باقاعدہ مصحف یعنی کتابی شکل میں موجود نہیں تھا اس اعتبار سے عمر فاروقؓ کے قول [حسبنا کتاب اللہ] کا مقصد آج مصحف کی صورت میں پائے جانیوالے قرآن کی طرف اشارہ نہیں ہوسکتا بلکہ [کتاب اللہ] سے عمر فاروقؓ کی مراد یقیناً [احکام اللہ] ہیں کیونکہ عربی زبان میں احکامات کو بھی کتاب کہا

جاتا ہے مثلاً سورۃ البینہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ رسول من الله يتلوا صحفا مطهرة ☆ فيها كتب قيمة ﴾

یعنی ''اللہ کا ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھے، جسمیں صحیح اور درست احکامات ہوں'' اسی طرح کہیں کہا گیا [کتب علیکم القصاص] اور کہیں کہا گیا [کتب علیکم الصیام] اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کا مطلب فرائض اور احکامات بھی ہوتے ہیں جبکہ اردو زبان میں جسے ہم کتاب کہتے ہیں اسکے لئے عربی زبان میں عام طور پر مصحف کا لفظ مستعمل ہے جیسا کہ مندرجہ بالا قرآنی آیت میں استعمال ہوا ہے درحقیقت منکرین حدیث عمر فاروقؓ کے اس قول کی غلط تاویل کر کے احادیث کی حجیت سے قطعی طور پر پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں حالانکہ عمر فاروقؓ سمیت تمام صحابہ کرام دینی معاملات میں احادیث کے حجت ہونے کے قائل تھے۔

کیا قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا؟:

پرویز صاحب نے کتاب التقدیر میں لکھا ہے کہ'' قرآن کریم کے مطالب تک پہنچنے کے راستے میں دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ ہم اسے بالعموم تراجم کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوسکتا'' پرویز صاحب نے یہ بات دراصل اس لئے کہی ہے تا کہ وہ قرآن کریم کی آیات کے مفہوم کے نام پر اپنے موقف کو قرآن کا فرمان بنا کر پیش کرسکیں اور کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ جناب آپ کی فلاں بات قرآن کی آیات کے ترجمہ کے سے مطابقت نہیں رکھتی مزید حفظ ماتقدم کے طور پر پرویز صاحب نے آگے یہ بھی لکھا دیا ہے کہ'' آئندہ صفحات میں آپ لکھا پائیں گے کہ اس آیت کا مروجہ ترجمہ یہ ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے'' یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرویز صاحب نے قرآن کے ترجمہ سے ہٹ کر قرآنی آیات کا جو مفہوم بیان کیا ہے اسکے لئے اپنا ماخذ و ذریعہ عربی لغت کو قرار دیا ہے لیکن چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں کوئی ایک بھی قابل ذکر ہستی ایسی نہیں جس نے قرآن کا وہ مفہوم بیان کیا ہو جو پرویز صاحب نے بیان کیا ہے خاص طور پر اہل زبان مفسرین میں سے کسی نے بھی قرآن کا مفہوم وہ نہیں سمجھا جو پرویز صاحب نے سمجھا ہے، اسکا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں پوری

امت مسلمہ قرآن کی تفسیر سے جاہل رہی اور قرآن کے نزول کے بعد پہلی بار اسکی تشریح وتوضیح پرویز صاحب پر کھلی ہے یہ ایک ایسی بات ہے جسکی تصدیق کسی مسلمان سے ممکن نہیں حتیٰ کہ خود منکرین حدیث بھی ایسی بات منہ سے نکالنے کی جرات نہیں کر سکتے، تو پھر کیا یہ کہا جائے کہ معاذ اللہ تمام مفسرین ومحدثین نے جان بوجھ کر امت مسلمہ کو قرآن کی صحیح تفسیر وتشریح سے محروم رکھا تو اس بات کو بھی اہل تشیع کے علاوہ مسلمانوں میں سے کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوگا یعنی امت مسلمہ کے نزدیک تمام اسلاف مفسرین ومحدثین مومن ومسلم ہیں اور ان کی بیان کردہ تفسیر وتشریح کے حق وصحیح ہونے پر امت کا اتفاق واجماع ہے، تو اب ایسی صورت میں ہم دیکھیں گے کہ پرویز اور اسکا بیان کردہ قرآنی مفہوم کس درجہ میں آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم وسائت مصیرا ☆سورۃ النساء ﴾

یعنی ’’جس نے ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعد رسول ﷺ کی مخالفت کی اور مومنین کے راستے کے سوا کسی دوسرے راستے کی پیروی کی تو ہم اسے اسکی راہ پر چلنے دیں گے اور آخر کار وہ جہنم میں جا پڑے گا جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے‘‘ پرویز صاحب کے سامنے تمام اسلاف کی تفاسیر ہدایت کے لئے موجود تھیں لیکن انھوں نے ان سب کو بیک جنبش قلم رد کر دیا اور خود قرآن کا مفہوم لکھا جسمیں احادیث نبوی ﷺ سے صرف نظر کرتے ہوئے محض اپنی عقل کو بنیاد بنایا اسطرح رسول ﷺ کی مخالفت کی مزید برآں تمام مفسرین کو مومن و مسلم تسلیم کرنے کے باوجود ان تمام قرآنی آیت کی ایک نئی تفسیر کی جن پر تمام اہل علم متفق تھے اسطرح مومنین کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو سیدھا جہنم کی طرف جاتا ہے مثلاً پرویز صاحب نے شیطان ابلیس اور جنات کے بارے میں قرآنی آیات کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ اسلام کی پوری تاریخ میں کسی اہل علم نے بیان نہیں کیا، یہ صرف پرویز صاحب کی اپنی ذہنی اختراع ہے جو قرآن کی تفسیر یا قرآنی آیات کا مفہوم نہیں بلکہ صریح قرآن کی تحریف ہے، پرویز صاحب نے کتاب التقدیر ص ۱۹۳ میں زیر عنوان ’’قرآن کریم کی تفسیریں لکھا ہے کہ سب سے پہلے محمد بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ نے تفسیر القرآن لکھی اس تفسیر میں انھوں نے ہر آیت کی تشریح میں روایات نقل کر دیں اور اسطرح یہ خیال قائم کر دیا کہ وہ تشریح انکی اپنی یا کسی اور کی نہیں

بلکہ خود رسالتماب ﷺ کی بیان کردہ تفسیر ہے، اسکے بعد سے آج تک جتنی بھی تفاسیر لکھی گئی ہیں ان کی بنیاد امام طبری کی تفسیر ہے'' پرویز صاحب کی اس تحریر میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ امام ابن جریر طبریؒ نے قرآن کی ہر آیت کی تفسیر بذریعہ روایات خود رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے حالانکہ پرویز صاحب کی یہ بات غلط ہے کیونکہ امام ابن جریر طبریؒ کی تفسیر آج بھی ہر جگہ دستیاب ہے جسمیں ہر آیات کی تفسیر نبی کریم ﷺ سے منقول نہیں بلکہ بیشتر حصہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے منقول تفسیر پر مشتمل ہے، اور پرویز صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اسکے بعد سے آج تک جو بھی تفاسیر لکھی گئی ہیں ان کی بنیاد ابن جریر کی تفسیر ہے یعنی پرویز صاحب نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ امت مسلمہ کے تمام علماء و فقہاء و مفسرین نے طبری کی تفسیر میں اپنائے گے اصولوں کو صحیح مانتے ہوئے انہی اصولوں کو اپنی تفاسیر کی بنیاد بنایا ہے جبکہ پرویز صاحب کے خیال میں تفسیر طبری کی بنیاد ہی غلط ہے اسکا مطلب یہ ہوا کہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں جس قدر بھی تفاسیر آج تک ہوئیں وہ سب غلط قرار پائیں اور تمام اہل علم جنہوں نے یہ تفاسیر لکھیں وہ سب قرآن سے جاہل رہے کیونکہ انھوں نے ایک بے بنیاد تفسیر پر اپنی تفاسیر کی بنیاد رکھدی اسطرح یہ امت پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کے منظر عام پر آنے تک قرآن سے جاہل ہی رہی بلکہ اہل عرب تو آج بھی قرآن سے جاہل ہوئے کیونکہ مفہوم القرآن کا ابھی تک عربی ترجمہ نہیں ہوا یعنی اگر پرویز صاحب یہ بات دعویٰ نبوت کے ساتھ کہتے اور اپنے آپ کو نبی و رسول کہہ کر پوری امت کی تفسیروں کو غلط کہتے تو شاید کچھ بات بنتی تھی مگر دعویٰ نبوت کے بغیر ایک پرویز صاحب کی جرح پر تمام امت کو گمراہ قرار نہیں دیا جاسکتا قارئین شاید ہماری اس بات کو مبالغہ آرائی خیال کریں اس لئے ثبوت کے طور پر ہم پرویز صاحب کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے تمام مترجمین و مفسرین کے بارے میں پرویز صاحب کا موقف کھل کر قارئین کے سامنے آجائے گا، پرویز صاحب ایک آیت کے ترجمہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿اس سے میرا مقصود یہ نہیں کہ آیت کا وہ ترجمہ غلط ہے، جب آیات قرآنی کا ترجمہ ممکن ہی نہیں تو اسکے صحیح یا غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:

یضل من یشاء ویھدی من یشاء ☆ سورۃ النحل ۹۳

اسکا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، آپ قرآن کے کسی نسخہ کو اٹھا کر دیکھ لیں اسمیں آپ کو یہی ترجمہ ملے گا حتی کہ آپ عربی زبان کی لغت کو اٹھا کر دیکھ لیں تو اسکی رو سے بھی اس آیت کا یہی ترجمہ کیا جائے گا، لیکن جب ہم تصریف آیات کی رو سے اس آیت کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائے گا کہ جو مفہوم اس ترجمہ کی رو سے متعین ہوتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے لہذا جب تک ہم قرآن مجید کے مختلف مقامات کی روشنی میں من یشاء کا مفہوم متعین نہیں کریں گے اس آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا ☆ کتاب التقدیر ص ٢٥،٢٦ ﴾ پرویز صاحب نے یہاں یہ بات تسلیم کی ہے کہ مذکورہ آیت کا یہ ترجمہ کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے'' عربی لغت'' کے اعتبار سے صحیح ہونے کے باوجود غلط ہے اور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے، اسکا مطلب یہ ہوا کہ تمام مفسرین قرآنی تعلیم سے جاہل تھے اور تصریف آیات کے فن سے ناواقف اور اگر ایسا نہیں تو پھر یقیناً پرویز صاحب پر کوئی وحی نازل ہوئی ہے جس کے سبب وہ تمام اہل علم اور عربی لغت کے خلاف آیت کا ترجمہ یا مفہوم بیان کر رہے ہیں پس پرویز صاحب کے بیان کردہ مفہوم کو صرف وہی شخص صحیح تسلیم کرسکتا ہے جو پرویز صاحب کو نبی و رسول مانتا ہو یا پھر عقل سے کورا ہو مگر اہل بصیرت کے لئے اسکی قبولیت کا قطعی کوئی امکان نہیں۔

پرویز صاحب اور فرقہ باطنیہ:

پرویز صاحب ایک جانب یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا اور دوسری جانب یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے جو بھی تراجم کئے گئے ہیں وہ عربی لغت کے قطعی مطابق ہیں اسکے باوجود پرویز صاحب نے ان ترجموں کو غلط کہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پرویز صاحب باطنیہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، باطنی فرقہ شیعہ کا اسماعیلی فرقہ ہے اس فرقہ کے عقیدے کے مطابق قرآن کریم کا ظاہری

ترجمہ و معنی لینا جائز نہیں بلکہ قرآن کا ایک باطنی مفہوم ہے جو اسکے ظاہر کے بالکل مخالف ہوتا ہے اور وہی باطنی مفہوم معتبر ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور یہ باطنی مفہوم صرف ائمہ شیعہ جانتے ہیں جن کا علم بغیر کسی واسطہ کے اللہ سے براہ راست حاصل ہوتا ہے اور وہی قرآن کا صحیح مفہوم بیان کر سکتے ہیں، اس فرقہ کے نزدیک قرآن کے الفاظ رموز و اشارات ہوتے ہیں جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتے یہی وجہ ہے کہ شیعہ تفاسیر میں قرآنی الفاظ کے باطنی معنی کئے گئے ہیں جو لغت عرب سے کسی طرح موافقت نہیں رکھتے مثلاً سورۃ النور کی تفسیر کرتے ہوئے شیعہ نے لکھا ہے کہ:

﴿فی الاحتجاج عن الحسن بن علی فی حدیث له مع معاویة و اصحابه وقدنالوا من علی الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات☆١٠٧ ج٥﴾

یعنی ''سورۃ نور یہ آیت جس میں ہے کہ خبیث مرد خبیث عورتوں کیلئے ہیں اور خبیث عورتیں خبیث مردوں کیلئے ہیں اس سے مراد معاویہ بن ابی سفیان اور اسکے ساتھی ہیں، اور پاک مرد پاک عورتوں کیلئے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کیلئے ہیں اس سے مراد علی بن ابی طالب اور ان کی جماعت والے شیعہ ہیں'' اسی طرح مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ ہو:

﴿امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض ☆ سورۃ العنکبوت ٦٢﴾

یعنی ''کون ہے جو پریشان حال کی پکار کو پہنچتا ہے جب وہ پکارے اور اس سے تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور اس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنا دیا ہے'' اس آیت کی تفسیر میں المیزان فی تفسیر القرآن میں لکھا ہے کہ:

﴿اس سے مراد شیعوں کا امام ہے جسے القائم کہتے ہیں وہ مضطر اور مجبور ہو کر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعات نماز پڑھکر دعا کرے گا اللہ تعالیٰ اسکی دعا سنے گا پھر اسکی مجبوری و مقہوری کو دور کر کے اسکو خلیفہ بنا دے گا ☆ المیزان ص ٣٩١ ج ٣﴾

اسی طرح سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ١٩ ''ان الدین عنداللہ الاسلام'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

﴿یہاں اسلام سے مراد تسلیم کرنا ہے اور تسلیم سے مراد علی بن ابی طالب کی خلافت کو تسلیم

کرنا ہے تو اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ کے نزدیک دین یہ ہے کہ علی کی خلافت کو تسلیم کیا جائے ☆المیزان ص ۱۲۶ ج ۱۵﴾

اسی طرح سورۃ الروم کی آیت ۳۰ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

﴿اس فطرت سے مراد جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے یہ کلمہ ہے ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی امیر المؤمنین علی ولی اللہ، الی ھاھنا التوحید'' یعنی وہ کلمہ جس کے پڑھنے سے انسان مسلمان ہوتا ہے یہی ہے جسمیں علی امیر المؤمنین ولی اللہ کہنا پڑیگا یہ پورا کلمہ توحید کہلاتا ہے اس سے کم نہیں اس لئے اس روایت کے آخر میں ''الی ھاھنا التوحید'' کے الفاظ ہیں یعنی یہاں تک پڑھنا توحید ہے ☆المیزان ص ۱۲۶ ج ۱۶﴾

اسی طرح سورۃ البقرۃ آیت ۳ میں ''الذین یومنون بالغیب'' کی تفسیر کرتے ہوئے المیزان ص ۴۶ ج ۱ پر لکھا ہے کہ ''اس سے مراد شیعوں کے امام القائم ہیں ان کو امام برحق ماننا مراد ہے'' اور اسی تفسیر کے ص ۱۴۱ ج ۱۷ پر سورۃ الصافات کی آیت ۲۴ کی تفسیر میں لکھا ہے ''وقفوھم انھم مسئولون'' ان کو روک دو ان سے سوال ہوگا اس سوال سے مراد علی بن ابی طالب کی خلافت کا سوال ہے مانا تھا یا نہیں'' یہ ہے باطنی تفسیر جس کی قرآن کریم کے ظاہری الفاظ و معنی سے کوئی مطابقت نہیں ہے پرویز صاحب نے بھی ایسی ہی باطنی تفسیریں کی ہیں اور یہ بات تسلیم کی ہے کہ انکا بیان نہ قران کی تفسیر ہے اور نہ ہی ترجمہ ہے جس کا ثبوت پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کے سرورق پر موجود یہ عبارت ہے کہ ''یہ نہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے نہ تفسیر بلکہ اسکا مفہوم ایسے واضح، مسلسل، مربوط اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ جس سے قرآنی مطالب تابندہ ستاروں کی طرح نگہ بصیرت کے سامنے ابھر کر آجاتے ہیں'' اس اعتبار سے پرویز صاحب باطنی فرقہ کے ایک اہم رکن قرار پاتے ہیں اور باطنی فرقہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ اس فرقہ کے عقائد اور اعمال اسلام سے مطابقت نہیں رکھتے یہ فرقہ اگرچہ قرآن پر ایمان کا دعویدار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باطنی فرقہ قرآن کا بھی منکر ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے عقیدے قرآن کے مطابق بنانے کے بجائے ہمیشہ قرآن کو اپنے عقیدے کے مطابق بنانے کی سرتوڑ کوشش میں لگے رہتے ہیں اس فرقہ کی بنیاد ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے رکھی تھی جو بظاہر

مسلمان ہوگیا تھا نیز اسی فرقہ کی وجہ سے مسلمانوں میں عقیدہ وحدۃ الوجود بھی آیا کیونکہ عبداللہ بن سبا کہا کرتا تھا کہ علی بن ابی طالب میں اللہ کی روح سرایت کرگئی ہے اور شیعہ بھی اپنے ائمہ میں اللہ کی روح مانتے ہیں نیز صوفیہ بھی انسان کے اندر جو روح ہے اسے اللہ کی روح کہتے ہیں اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صوفیہ کا عقیدہ وحدۃ الوجود شیعہ کا ہی پیدا کردہ ہے نیز شیعہ کی طرح صوفیہ بھی قرآن کی باطنی تفسیر کرتے ہیں خواہ وہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے مطابقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو اسی طرح پرویز صاحب نے بھی اہل مغرب کے عقائد اور اعمال سے مرعوب ہوکر قرآنی آیات کی ایسی تفسیر کی ہے جو مغرب زدہ افراد کے لئے قابل قبول ہو اور انکے احساس کمتری کا کسی قدر مداوا کرسکے مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ کی آیت ''انعمت علیھم'' کی تفسیر ملاحظہ ہو لکھتے ہیں کہ:

﴿یعنی وہ راستہ جس پر چل کر سعادت مند امم سابقہ زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں اس سے انھوں نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرکے اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کرلی ☆ مفہوم القرآن﴾

یہاں پرویز صاحب نے ''انعمت علیھم'' اس قوم کو قرار دیا ہے جو کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے جبکہ نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام اور خلفاء بنی امیہ اور بنو عباس میں سے کسی نے بھی کائنات کو مسخر کرکے راکٹ، ہوائی جہاز بنائے اور نہ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کا نظام وضع کرسکے یعنی کائنات کو مسخر کرنے کیلئے کچھ نہیں کیا البتہ اہل مغرب نے گذشتہ زمانے میں تسخیر کائنات کا یہ تمام کام کیا اور اسی وجہ سے وہ امت مسلمہ کو غلام بنائے ہوئے ہیں یعنی پرویز صاحب کی تفسیر کے مطابق ''انعمت علیھم'' کے مصداق یہی یورپ اور امریکہ والے ہیں اور آج ہر مسلمان اپنی نماز میں یہ دعا کررہا ہے کہ یا اللہ جس طرح تو نے یورپ والوں پر انعام کیا ہے اسی طرح ہم پر بھی انعام کر اور ہمیں انکے راستے پر چلادے، پس ہمارے خیال میں قرانی آیات کی اس قسم کی تحریف کے بعد پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کو مفہوم القرآن کے بجائے تحریف القرآن کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

تصریف آیات کا معنی ومفہوم:

پرویز صاحب نے کہا ہے آیت (یضل من یشاء ویھدی من یشاء) کا تصریف آیات کی رو سے جو مفہوم متعین ہوتا ہے اسکی رو سے مفسرین کا ترجمہ صرف غلط ہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کے بھی خلاف ہے پرویز صاحب کے اس بیان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی تئیس ۲۳ سالہ زندگی میں مکمل ہوا اور بعض سورتوں کے مابین برسوں کا فاصلہ ہے اسی طرح بعض آیات کے مابین بھی مہینوں اور سالوں کا فاصلہ ہے اس اعتبار سے بعض آیات کا ترجمہ بعض دوسری آیات کی وجہ سے کیسے غلط ہوسکتا ہے جبکہ ان آیات کے نزول کے مابین مہینوں اور سالوں کا فاصلہ ممکن ہے یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آیت کا معنی ومفہوم کسی دوسری آیت پر موقوف ہو جو اس آیت سے مہینوں اور برسوں بعد نازل ہوئی ہو، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت کا ظاہری معنی ومفہوم کسی دوسری آیت پر موقوف ہو جو قرآن کی سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے اس آیت سے بہت آگے یا پیچھے واقع ہوئی ہو اسطرح قرآن کریم سے ہر عام وخاص فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ وہ قرآن کی تمام سورتوں کے معنی ومفہوم پر مکمل دسترس نہ رکھتا ہو، نیز یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی آیات نازل ہی کیوں کیں جو اپنے ظاہری معنی پر نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھکر ان آیات کا صحیح معنی ومفہوم انکے ظاہری معنی کے بالکل برعکس وخلاف ہے جو دوسری آیات سے تقابل کے بغیر سمجھی ہی نہ جاسکتی ہوں اس اعتبار سے وہ آیات جو اپنے ظاہری معنی پر نہیں بلکہ اپنے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے کسی دوسری آیت یا آیات کی محتاج ہوں بے مقصد اور بلافائدہ قرار پائیں گی حالانکہ قرآن کریم کی کسی آیت کے بارے میں بھی یہ نظریہ رکھنا کہ وہ بے معنی و بے مقصد ہے صریح کفر ہے۔

من یشاء کا معنی ومفہوم:

پرویز صاحب کتاب التقدیر ص ۲۱۷ پر رقمطراز ہیں کہ:

﴿عربی زبان کے قاعدہ کی رو سے ''من یشاء'' کے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ جسے اللہ چاہے اور دوسرے یہ کہ جو شخص ایسا چاہے مثلاً ''یضل من یشاء ویھدی من یشاء'' کے

دو معنی ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ جسے اللہ چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت دے اور دوسرے یہ کہ جو شخص ہدایت لینا چاہے اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے وہ گمراہ رہتا ہے اسی طرح ''یسبط الرزق لمن یشاء ویقدر'' کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ جو شخص چاہے اسے رزق کشادہ ملے اور جو اپنے لئے رزق کی تنگی چاہے اسکی روزی تنگ ہوجاتی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں معنی میں ترجیح کن معنی کو ہوگی سو اسکا جواب آسان ہے کہ ان آیات کا وہ مفہوم صحیح ہوگا جو قرآن کریم کی دیگر آیات کے مطابق ہوگا اور قرآن کی کلی تعلیم کا محور قانون مکافات عمل ہے یعنی انسان کو اسکے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے لہذا ان آیات کا وہی مفہوم قرآنی تعلیم کے مطابق ہوگا جس میں من یشاء کا فاعل انسان کو تصور کیا جائے گا﴾

اس مقام پر پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ اس آیت کے دو معنی ہوسکتے ہیں قابل اعتراض ہے کیونکہ جو معنی یہاں پرویز صاحب نے کیا ہے قرآن کے نزول کے بعد سے آج تک کسی نے نہیں کیا بلکہ یہ پرویز صاحب کی اپنی ذہنی اختراع ہے اور ایسا کوئی قاعدہ کلیہ کسی کتاب میں موجود نہیں جس کا ذکر پرویز صاحب عربی قاعدہ کہہ کر کر رہے ہیں درحقیقت یہ پرویز صاحب کی عربی زبان سے ناواقفیت کی کھلی دلیل ہے کیونکہ عربی زبان میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں جس کی رو سے دوسرا معنی صحیح ہو مثلاً سورۃ النحل آیت ۹۳ میں ارشاد ہوا:

﴿لو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدہ ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء﴾

یہاں اس آیت کا معنی یہ کرنا کہ ''اللہ تعالیٰ اسکو ہدایت سے محروم کرتا ہے جو گمراہی چاہتا ہے اور اسکو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت چاہتا ہے'' ناممکن ہے کیونکہ یہاں یشاء کا فاعل اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ شخص کو بنایا گیا ہے اور جب شیاء کا فاعل انسان ہوا تو شیاء میں ''ھو'' ضمیر مانی جائے گی جسے یشاء کا فاعل کہا جائے گا اب یہاں یشاء کا فاعل تو موجود ہوگیا لیکن اسکا مفعول موجود نہیں اور جب تک یشاء کا مفعول موجود نہ ہو اس وقت تک پرویز صاحب کا بیان کردہ دوسرا معنی ناممکن ہے یعنی پرویز صاحب کا بیان کردہ دوسرا معنی اس وقت

درست ہوگا جب قرآن کے الفاظ یوں ہوں ''یضل من یشاء الضلالۃ ویھدی من یشاء الھدایۃ'' کیونکہ پرویز صاحب جب یشاء کا معنی جو ہدایت چاہے اسے ہدایت ملتی ہے اور جو گمراہی چاہے اسے گمراہی ملتی ہے کرتے ہیں تو اس معنی کے اعتبار سے یشاء کے بعد الضلالۃ اور الھدایۃ کے الفاظ ہونا ضروری ہیں پس جب قرآن میں اس قسم کے الفاظ موجود ہی نہیں تو اسطرح کا ترجمہ کرنا قرآن کی تحریف کہلاتا ہے، درحقیقت قرآن کریم میں گمراہی کا فاعل متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کو بنایا گیا ہے لیکن سورۃ الجاثیہ میں اللہ تعالیٰ نے اس نسبت کی وضاحت کردی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ واضله الله على علم ☆ سورة الجاثية ٢٣﴾

یعنی ''اللہ نے اس پر اپنے علم کی بنیاد پر گمراہی کا حکم لگایا'' لیکن پرویز صاحب نے اس آیت کی بھی تحریف کرڈالی حالانکہ یہاں لفظ ''یشاء'' بھی موجود نہیں جو پرویز صاحب کے کام آسکتا ہو چناچہ مفہوم القرآن میں وہ لکھتے ہیں کہ:

﴿تم نے دیکھا کہ وہ علم وعقل رکھنے کے باوجود کس طرح غلط راستوں پر چلا جاتا ہے اور اس پر جذبات بری طرح غالب آجاتے ہیں کہ یوں نظر آتا ہے کہ گویا اسکے کانوں اور دل پر مہر لگ چکی ہے☆مفہوم القرآن ص ۱۱۶۹﴾

یعنی اگر اس آیت کا وہ ترجمہ ممکن ہوتا جو پرویز صاحب نے کیا ہے تو فتنہ انکار تقدیر کے قائلین میں سے کوئی نہ کوئی اسکو اپنی دلیل ضرور بناتا کیونکہ تقدیر کے انکار کا فتنہ نیا نہیں بلکہ کافی قدیم ہے حتی کہ اہل عرب میں جبریہ اور قدریہ کے نام سے باقاعدہ طور پر فرقے موجود رہے ہیں اسکے باوجود آج تک کسی تقدیر کے منکر عربی عالم نے ''یشاء'' کا وہ ترجمہ نہیں کیا جو پرویز صاحب نے کیا ہے، اس ترجمہ کے ناممکن ہونے کے باوجود اگر بالفرض والمحال یہ ترجمہ صحیح مان بھی لیا جائے تو پھر آیت ﴿واضلہ اللہ علی علم ☆ سورۃ الجاثیہ﴾ کا کیا معنی ہوگا یہاں پر ''من یشاء'' ہے ہی نہیں اور لفظ اضل کا فاعل اللہ موجود ہے اسکا ترجمہ یہ ہے کہ ''اللہ نے اسکو اپنے علم کے مطابق گمراہ پایا'' یعنی وہ اللہ کے علم میں ہدایت کے قابل نہیں تھا اسلئے اللہ نے اس پر گمراہی کا حکم جاری کردیا اسکی توثیق ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ ولوعلم الله فیهم خیرا لا سمعهم ولواسمعهم لتولواهم معرضون ☆ سورة انفال ﴾

یعنی ''اگراللہ ان میں کوئی بھلائی پاتا تو ان کوقرآن سننے اور سمجھنے کی توفیق عطا کر دیتا،اوراگر یونہی ان میں خیر وبھلائی نہ ہونے کے باوجود ان کوسنواتا تو وہ منہ موڑ کر چلے جاتے'' پرویز صاحب کے مذکورہ موقف کا رداس آیت کریمہ میں بھی موجود ہے جسمیں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا ☆ سورة البقرة ۲۶ ﴾

یعنی'' اس مثال سے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو ہدایت سے محروم کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے'' یہاں اس آیت میں یضل بہ کثیرا اور یھدی بہ کثیرا کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور یہاں ''کثیرا '' مفعول بہ ہے،کیا پرویز صاحب یہاں بھی یہی ترجمہ کریں گے کہ ''اس مثال سے بہت سے لوگ گمراہ ہوجاتے ہیں اور بہت سے لوگ ہدایت پاتے ہیں'' حالانکہ یہ ترجمہ کسی طور ممکن نہیں کیونکہ عربی قاعدہ کے اعتبار سے اگر یہ کہنا ہوتا تو الفاظ اس طرح ہوتے ''یھتدی بہ کثیر ویضل بہ کثیر''یعنی یضل کی ''ی'' پر زبر اور کثیر کی ''ر'' پر پیش اور یھدی کے بجائے یھتدی ہوتا چونکہ غیر عرب عوام عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے پرویز صاحب نے قرآن کی غلط اور عربی زبان کے قواعد وضوابط کے برعکس تفسیریں کر کے اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے جو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

فراخی وتنگی رزق کا مسئلہ:

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ الله یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر ☆ سورة الرعد ۲۶ ﴾

اس آیت کا ترجمہ پرویز صاحب نے اسطرح کیا ہے کہ ''جو شخص چاہے اسے رزق کشادہ مل سکتا ہے اور جو اپنے لئے تنگی چاہے اسکی روزی تنگ کردی جاتی ہے'' اس آیت کا یہ ترجمہ وتفسیر عربی زبان کے قواعد و ضوابط کے قطعی خلاف ہے اور قرآن کے الفاظ کا اس طرح ترجمہ کرنا قرآن کی تحریف ہے کیونکہ خود پرویز

صاحب نے لغات القرآن ص ۳۲۰ ج ۱ میں ''بسط'' کے اعنوان کے تحت لکھا ہے ''بسط کے معنی ہیں پھیلانا نشر کرنا، توسیع کرنا اور وسعت دینا'' اس اعتبار سے اس آیت کا معنی ہوا کہ اللہ جس کے رزق کو چاہتا ہے وسعت دیتا ہے، پھیلاتا ہے، فراخ کرتا ہے یعنی جب لفظ ''یبسط'' سے قبل لفظ ''اللہ'' موجود ہے تو اسکا مطلب واضح طور پر یہ ہوا کہ اللہ ہی رزق کو فراخ کرتا ہے اس اعتبار سے پرویز صاحب کا ترجمہ قرآن کے بیان کے خلاف اور تحریف ہے کیونکہ عربی لغت کے قواعد میں سے ایک قاعدہ افعال کا متعدی اور لازم ہونا بھی ہے اور یہاں لفظ ''یبسط''، فعل متعدی ہے مگر پرویز صاحب نے اسکا معنی فعل لازم والا کیا ہے اسی طرح لفظ ''اضل''، فعل متعدی ہے مگر پرویز صاحب نے اسکا معنی بھی لازم والا کیا ہے جو کہ قرآن کی صریح تحریف ہے علاوہ ازیں جس عقل کا منکرین حدیث اتنا ڈھنڈوا پیٹتے ہیں اور احادیث کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی بات کرتے ہیں کیا اس عقل کے اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی روزی تنگ کرنا چاہے، یقیناً اس قسم کی چاہت محال و ناممکن ہے اور جو چیز فطرت انسانی کے خلاف اور ناممکن الوقوع ہو قرآن کس طرح اسکو جائز اور ممکن قرار دے سکتا ہے، درحقیقت یہی وہ تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ اپنی کتابوں میں کیا کرتے تھے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ یحرفون الکلم عن مواضعه ☆ سورة النساء ۴۶ ﴾

یعنی ''وہ لوگ بات کو اسکے محل سے ہٹا دیتے ہیں'' پرویز صاحب لغات القرآن میں تحریف کی تعریف لکھتے ہوئے خود فرماتے ہیں کہ:

﴿ تحریف کے معنی اسطرح کی توجیہ و تاویل کرنا ہیں جس سے اسکی اصل روح جاتی رہے جو دراصل اسکا رأس المال ہے، خواہ یہ تحریف الفاظ کے ردو بدل سے ہو یا مفہوم کی تبدیلی سے واقع ہو، اہل کتاب نے اپنی آسمانی کتابوں میں جو تحریف کی ہے اسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں فرمایا ''وہ کلمات کو ان کے مقام سے ہٹا دیتے ہیں'' اس سے تحریف لفظی بھی مراد ہوسکتی ہے اور تحریف معنوی بھی ☆ لغات القرآن ص ۴۸۸ ج ۲ ﴾

اب قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ پرویز صاحب کا بیان کردہ مفہوم جو تمام تراجم کے خلاف ہے،

تمام متقدمین ومتاخرین مفسرین کے خلاف ہے اور سب سے بڑھکر اس عربی لغت کے بھی خلاف ہے جس کو پرویز صاحب نے اپنے مفہوم القرآن کی بنیاد بنایا ہے اور ایسی صورت حال میں مفہوم القرآن کو اگر تحریف القرآن کہا جائے تو کیا زیادہ بہتر نہیں ہوگا؟ پس قران کی مندرجہ ذیل آیت پرویز صاحب کے مفہوم القرآن پر ہی صادق آتی ہے، سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ ﴾

یعنی ''یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے'' یہی کام پرویز صاحب نے بھی کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اقوال واعمال کی صحت کو مشکوک قرار دے کر اٹھا پھینکا، مفسرین کو ایک دوسرے کا نقال اور ناقص الفہم قرار دیکر نا قابل اعتبار قرار دے دیا، مغرب زدہ مرعوب ذہنیت کو عقل کی کسوٹی قرار دیا اور عربی زبان سے نابلد معاشرے کو عربی لغت کے فریب میں مبتلا کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیا تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک جانب پرویز صاحب قرآن کی لغت لکھتے ہیں اور دوسری جانب جب مفہوم القرآن لکھنے بیٹھتے ہیں تو اسی لغت کی دھجیاں اڑاتے ہیں مثال کے طور پر مفہوم القرآن میں ہر جگہ لفظ ''اضل'' کا معنی ''ضل'' کیا ہوا ہے حالانکہ یہ عربی لغت کے خلاف ہے اور قرآن کی کھلی تحریف ہے۔

ارادہ اور مشیت میں فرق کا بیان:

پرویز صاحب کتاب التقدیر میں صفحہ ۱۹۵ پر لکھتے ہیں کہ:

﴿ مشیت کا معنی ارادہ کرنے کے ہیں بعض متکلمین نے ارادہ اور مشیت کے معنی میں کوئی فرق نہیں کیا ہے لیکن لغت کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق ہے، ارادہ فقط کسی بات کے چاہنے کو کہتے ہیں اور جب اس ارادہ کے مطابق وہ بات وجود میں آ جائے تو اسے مشیت کہا جاتا ہے اس لئے شئی کسی ارادے کے وجود پذیر شکل کا نام ہے، جب ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے تو ارادہ اور مشیت کے فرق کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے ﴾

پرویز صاحب اسی عنوان کے تحت مزید لکھتے ہیں کہ:

﴿قرآن کریم سورۃ یٰسین میں ہے کہ ''انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول له کن فیکون'' خدا کا امر یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے، یہاں سے واضح ہے کہ جب ارادہ خداوندی ''فیکون'' وجود میں آجانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اسے مشیت کہا جاتا ہے﴾

پرویز صاحب نے یہاں جو ارادہ اور مشیت کا فرق بیان کیا ہے ہم اسکا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیتے ہیں تو پرویز صاحب کی تحقیق کو ناقص پاتے ہیں کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں مشیت کا لفظ نہیں بلکہ لفظ ''شیئا'' ہے جس کا معنی کوئی چیز یا کوئی کام ہے جس کا ہو جانا اللہ تعالیٰ نے مقرر کر لیا ہو لہذا اس آیت میں لفظ شیئا کا معنی ''چیز'' اور ''کام'' ہے مشیت ہرگز نہیں، اور اگر بقول پرویز صاحب مشیت وجود پذیر شکل کا نام ہے تو پھر اس فرق کے اعتبار سے سورۃ یٰسین کی مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ وہ ہو ہی نہیں سکتا جو پرویز صاحب نے کیا ہے یعنی جب [شئی] موجود چیز کو کہتے ہیں تو پھر اس چیز کو [کن فیکون] کیسے کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ تو پہلے سے ہی موجود ہے پس ارادہ اور مشیت میں فرق ہو یا نہ ہو اس سے اعتقادی مسائل میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ مشیت اور رضائے الٰہی میں فرق ضرور ہے جسکی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

عربی اردو لغت کی مشہور کتاب المنجد صفحہ ۵۵۰ پر لکھا ہے:

﴿الشئی مصدر ہے اسکا معنی ہے چیز، جو چیز جانی پہچانی جا سکے اور جس کی خبر دی جا سکے اور ''الشیئۃ'' شاء کا اسم ہے اور المشیئۃ کا معنی ہے ارادہ﴾

اس سے معلوم ہوا کہ مشیت ارادے ہی کو کہتے ہیں اور لغت کی کتاب قاموس المحیط صفحہ ۱۹ جلد ۱ میں ہے کہ ''شئتہ، اشاء، شیئا اور مشیئۃ اردتہ کا معنی ہے میں نے اسکو چاہا اسکا ارادہ کیا'' یہاں بھی مشیت اور ارادہ کو ہم معنی کہا گیا ہے اسی طرح راغب اصفہانی کی کتاب مفرادت الفاظ القرآن الکریم جس کو ہند و پاک میں مفردات فی غریب القرآن کہا جاتا ہے میں ہے:

﴿الشئی قیل ھو الذی یصح ان یعلم ویخبر عنه﴾

یعنی ''شئی اس چیز کو کہتے ہیں جسکی خبر دینا درست اور صحیح ہو'' اور یہ لفظ علماء متکلمین کی اکثریت کے

نزدیک اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے مابین مشترک ہے نیز یہ لفظ موجود اور غیر موجود دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن بعض دیگر علماء کے نزدیک یہ لفظ صرف موجود پر ہی بولا جاتا ہے اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ پر بولا جائے تو اس کا معنی ہوگا اس نے چاہا اور جس وقت مخلوق پر بولا جائے تو اسکا معنی ہوگا ''چیز'' اسی دوسرے معنی میں یہ آیت ہے کہ:

﴿ اللہ خالق کل شئی ☆ سورۃ الزمر ﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنیوالا ہے'' جبکہ مشیت کا لفظ اکثر علماء متکلمین کے نزدیک ارادہ کے معنی میں آتا ہے اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک اسکا اصل معنی ہے کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اسے حاصل کرنا ہے اگر چہ عرف عام میں یہ لفظ ارادہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور جب یہ لفظ اللہ کے بارے میں بولا جائے گا تو اس کا معنی کسی چیز کو ایجاد کرنا اور پیدا کرنا ہوگا اور جب انسان کے بارے میں بولا جائے تو اسکا معنی کسی چیز کو حاصل کرنا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی چیز کے وجود کو بیان کرتی ہے اسلئے کہا جاتا ہے کہ:

﴿ ماشاء اللہ کان ومالم یشاء لم یکن ﴾

یعنی ''جس کام میں اللہ کی مشیت ہوتی ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور جس میں مشیت نہیں ہوتی وہ نہیں ہوسکتا'' اسکے علاوہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ جس چیز کے متعلق ہوا سکا موجود ہونا لازمی اور ضروری بھی نہیں، علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ اللہ کی مشیت ہر حال میں وقوع پذیر ہوتی ہے جبکہ ارادہ ضروری نہیں کہ وقوع پذیر ہو اسکی مثال انھوں نے سورۃ البقرۃ کی ایک آیت سے دی جسمیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

﴿ یریداللہ بکم الیسر ولایرید بکم العسر ☆ سورۃ البقرۃ ١٨٥ ﴾

یعنی ''اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں چاہتا'' یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ تمہارے لئے تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں پر تنگی آتی رہتی ہے حتی کہ صحابہ کرام پر بھی تنگی آئی تھی اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ جس آسانی کے ارادے کا ذکر کیا ہے وہ بسا اوقات وقوع پذیر نہیں ہوتا یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جو ارادہ اور مشیت کے مابین فرق کے قائل ہیں اور جو ارادہ اور مشیت کے مابین فرق کے قائل نہیں انکی طرف سے مذکورہ دلیل کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس آیت

میں اللہ تعالیٰ نے جس آسانی کا وعدہ کیا ہے وہ دینی احکامات کے بارے میں ہے انسان کے عام حالات سے اسکا کوئی تعلق نہیں اور اس ضمن میں جو دوسری دلیل ذکر کی جاتی ہے کہ:

﴿ وما اللہ یرید ظلما للعباد ☆ سورۃ غافر ۳۱ ﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں'' تو یہ بات سب کو معلوم ہے کہ انسان کو تنگی بھی پیش آجاتی ہے اور لوگوں کے مابین ظلم وفساد بھی ہوتا رہتا ہے، چونکہ انسانوں کے افعال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے لہذا لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی یا فساد اللہ ہی کی مشیت وارادہ سے ہوا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں کچھ استثناء بھی ہوتا ہے اور لوگوں کے مابین جو ظلم وفساد ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ یہ بندوں کا فعل ہے اور قرآن کی مذکورہ آیت میں اللہ کے بندوں پر ظلم نہ کرنے کا ذکر ہے لیکن بندوں کے بندوں پر ظلم کرنے کی اس میں کوئی نفی نہیں نیز بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور انسان کے ارادہ کے مابین ایک فرق یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ میں مطلق آزاد ہے جبکہ انسان اپنے ارادہ میں مطلق آزاد نہیں یعنی انسان کبھی کبھی ایسا ارادہ کر بیٹھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہ کیا ہو تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ انسان کے ارادہ پر غالب آجاتا ہے اسی کو مشیت الٰہی کہتے ہیں مثلاً ایک شخص ارادہ کر بیٹھتا ہے کہ کبھی مرے گا نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ ہر ذی روح کی موت کا ارادہ کر چکا ہے ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس انسان کی مرضی اور ارادہ کے برخلاف اسے موت دے دیتا ہے یعنی انسان کی مشیت اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر انسان کا اپنے ارادہ کو پائے تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں ہے لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے کچھ اصول وضوابط بھی مقرر فرما دیئے ہیں، اگر انسان ان اصول وضوابط کا لحاظ کرتے ہوئے ارادے کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کے ان ارادوں کی تکمیل کا قوی امکان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ ان ھو الا ذکر للعالمین لمن شاء منکم ان یستقیم ☆التکویر ۲۸ ﴾

یعنی ''یہ قرآن جہاں والوں کے لئے نصیحت ہے، اور اس شخص اور قوم کے لئے جو سیدھی راہ پر چلنا چاہے'' روایات میں آتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر کفار نے کہا لو ہمارے معاملات تو ہمارے ہاتھوں

میں ہیں ہم چاہیں تو سیدھی راہ پر چلیں اور چاہیں تو نہ چلیں، تو کفار کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الدھر کی یہ آیت نازل فرمائی، ارشاد ہوا:

﴿ وما تشاؤن الاان یشاء اللہ ☆ سورۃ الدھر ۳۰﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تمہاری اپنی کوئی مشیت نہیں بلکہ تمہاری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے یعنی ''تم کوئی چیز نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ اس چیز کو نہ چاہے'' بعض علماء نے کہا کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقف نہ ہوتے تو انسان کا کسی بھی کام کے معاملے میں انشاء اللہ کہنا درست نہ ہوتا جبکہ قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ ہر کام میں انشاء اللہ کہا جائے، مثلاً سورۃ الکھف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ ولاتقولن لشئی انی فاعل ذالک غدا الا ان یشاء اللہ ﴾

یعنی ''اے نبی ﷺ آپ کسی کام کے بارے میں یہ نہ فرمائیں کہ میں اسکو کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے'' یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو یہ کام ہوگا ورنہ نہیں ہوگا یہاں اس آیت میں الفاظ ''الا ان یشاء اللہ'' سے اس کام کی تکمیل کو اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے لیکن اگر یہاں مشیت کا معنی ارادہ نہ لیا جائے بلکہ بقول پرویز صاحب ''شئی کسی ارادے کے وجود پذیر شکل کا نام ہے'' تسلیم کرلیا جائے تو اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کام کے ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے تو یہ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا لیکن پرویز صاحب اس مفہوم کو تسلیم کرنے پر ہرگز راضی نہیں ہوسکتے ورنہ مسئلہ تقدیر پر انکا موقف اسی ایک ٹھوکر سے زمیں بوس ہوجائیگا کیونکہ اس معنی کے لحاظ سے انسان اپنے ارادے اور اختیار سے کچھ بھی نہیں کرسکتا بلکہ انسان سے وہی ہوسکے گا جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کر چکا ہے اسی طرح پرویز صاحب نے ارادہ اور مشیت کا جو فرق لکھا ہے ہم اسکو سورۃ الکھف کی ایک دوسری آیت پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لو شئت لاتخذت علیه اجرا ☆ سورۃ الکھف ۷۷ ﴾

یعنی ''اگر تم چاہتے تو جو تم نے کیا اس پر معاوضہ طلب کر سکتے تھے'' یہ آیت سورۃ الکھف میں مذکور موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق ہے جہاں خضرؑ ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دیتے

ہیں باوجود اسکے کہ اس بستی والوں نے موسیٰؑ اور خضرؑ کے ساتھ برا سلوک کیا ہوتا ہے اس پر موسیٰؑ قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے خضرؑ سے فرماتے ہیں کہ ''اگر آپ چاہتے تو اس کام کا معاوضہ وصول کر سکتے تھے'' یہاں یہ ترجمہ نہایت واضح اور صحیح ہے لیکن اگر مشیت کا وہ معنی لیا جائے جو پرویز صاحب نے کہا ہے تو اس آیت کا ترجمہ ناممکن ہے کیونکہ ''شئت'' سے قبل ''لو'' کا لفظ موجود ہے جس کا معنی ''اگر'' ہے اور پرویز صاحب کے بقول ''شئی کسی ارادے کے وجود پذیر شکل کا نام ہے'' اور اصولی طور پر جو چیز وجود میں آچکی ہو اسکے لئے ''اگر'' کا لفظ استعمال نہیں ہوسکتا مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ''اگر میں انسان ہوتا تو فلاں کام کرتا'' تو یہ ایک لغو جملہ ہوگا کیونکہ وہ بطور انسان پہلے ہی وجود میں آچکا ہے اور معاذ اللہ قرآن کوئی لغو کلام نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو لایعنی ہو اسلئے مشیت اور ارادے میں فرق قرار دینے کے باوجود پرویز صاحب نے بھی مفہوم القرآن میں اس آیت کا ترجمہ وہی کیا جو دوسروں نے کیا ہے، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر انسان کا اپنے اعمال وافعال پر انشاء اللہ کہنا ثابت ہے مثلاً سورۃ الصافات کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿ ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین ☆ سورۃ الصافات ۱۰۲ ﴾

یعنی جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خواب کا تذکرہ اسماعیل علیہ السلام سے کیا تو اسماعیل علیہ السلام اس خواب میں دیئے جانے والے حکم کو پورا کرنے اور ذبح ہونے کے لئے تیار ہو گئے اور فرمایا ''اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے'' اسی طرح ایک دوسری آیت میں موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے کہا تھا کہ:

﴿ ستجدنی ان شاء اللہ صابرا ☆ سورۃ الکھف ۶۹ ﴾

یعنی ''اللہ کی مشیت ہوئی تو آپ مجھے صابر پائیں گے'' لیکن موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے اور خضر سے ان امور پر بار بار استفسار کرتے رہے جو خضر علیہ السلام نے انجام دیئے، اسی طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو عذاب الٰہی کی جو نوید سنائی اسمیں کہا:

﴿ یاتیکم بہ اللہ ان شاء ☆ سورۃ ھود ۳۳ ﴾

یعنی ''اللہ نے چاہا تو تمہارے اوپر عذاب ضرور لائے گا'' اسی طرح یوسف علیہ السلام نے اپنے

والدین اور بھائیوں سے کہا تھا کہ:

﴿ ادخلوا مصر ان شاء اللہ آمنین ☆سورۃ یوسف ۹۹ ﴾

یعنی ''مصر میں داخل ہوجاؤ اللہ کی مشیت ہوئی تو تم امن سے رہو گے'' لیکن بنی اسرائیل مصر میں زیادہ دیر امن سے نہ رہ سکے اور فرعون کے ظلم کا شکار ہوئے، اسی طرح ایک مقام پر نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿قل لااملک لنفسی نفعا ولا ضرا الاماشاء اللہ☆ سورۃ اعراف۱۸۸﴾

یعنی ''کہہ دیجیئے اے نبی ﷺ میں اپنے نفس کے نفع نقصان کا بھی مالک نہیں مگر اللہ چاہے تو'' علامہ راغب اصفہانی نے المفرادت میں ''ارادہ'' اور ''مشیت'' کی تعریف میں فرق بیان کیا ہے جسے پرویز صاحب نے من عن نقل کردیا ہے لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ علامہ راغب اصفہانی اہل سنت کے عقیدہ پر تھے اور انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے انسان کی مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اور اسکا ثبوت انھوں نے قرآنی آیت سے پیش کیا ہے پس معلوم ہوا کہ مشیت اور ارادہ میں جو فرق پرویز صاحب نے روا رکھا ہے وہ محض ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس کا مقصد انکار تقدیر کے نظریہ کا دفاع اور قرآن کی معنوی تحریف ہے، اسکے علاوہ پرویز صاحب نے ''مشیت'' اور ''ارادہ'' کی تعریف میں جو تفریق کی ہے وہ بھی غلط ہے کیونکہ قرآن میں یہ الفاظ باہم متبادل کے طور پر بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً نوح علیہ السلام کے قصہ میں اللہ فرماتا ہے:

﴿ ولاینفعکم نصحی ان اردت ان انصح لکم ان کان اللہ یرید ان یغویکم ☆ سورۃ ھود ۳۴﴾

یعنی ''میرا تم کو نصیحت کرنا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کرلیا ہے'' یہاں نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ایک کام کے فیصلہ کرلینے کو لفظ ''ارادہ'' سے بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ارادہ ومشیت دونوں ہم معنی ہیں۔

''لوشاء اللہ'' کے مفہوم کا تعین:

پرویز صاحب اپنی کتاب التقدیر میں اسی عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

﴿اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو'' حالانکہ اسکا صحیح ترجمہ یوں کرنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس قسم کا قانون مشیت مقرر کر دیتا تو ایسا ہو جاتا، مثلاً اگر کہا جائے کہ نمک نمکین کیوں ہوتا ہے تو اسکا جواب ہوگا کہ خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ نمک نمکین ہو، اگر اسکا قانون مشیت یہ ہوتا کہ نمک میٹھا ہو تو میٹھا ہو جاتا، اگر یہ کہا جائے کہ اگر خدا چاہے تو نمک اب بھی میٹھا ہو سکتا ہے یا نہیں تو اسکا جواب میں کہا جائے گا کہ اگر وہ چاہے تو ایسا ہو سکتا ہے لیکن وہ ایسا چاہے گا نہیں کیونکہ اس نے قوانین مشیت مقرر کر دینے کے بعد خود ہی کہا ہے کہ وہ ان قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا﴾

پرویز صاحب نے یہاں جو لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا سے مراد قرآن میں سورۃ الاحزاب کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنت الله تبدیلا☆ ٦٢﴾

یعنی ''یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے بارے میں جو تم سے قبل گذر چکے ہیں تم اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے'' اس ایک آیت کی بنیاد پر پرویز صاحب نے قرآن کی ان تمام آیات کی معنوی تحریف کی ہے جہاں کسی بھی معجزہ کا ذکر ہے اور انبیاء کرام کے ان تمام معجزات کا کھلم کھلا انکا کیا ہے جو خرق عادت ہیں اور کائنات کے عام قوانین کے خلاف ہیں مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا عصاء مارنے سے سمندر کا پھٹ جانا، عیسیٰ علیہ السلام کا مردے کو زندہ کر دینا، ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا ٹھنڈا ہو جانا اور نبی کریم ﷺ کے اشارے پر چاند کا ٹکڑے ہونا وغیرہ وغیرہ حالانکہ مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کی صرف اس سنت کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ دین کا راستہ روکنے والے ملعونین کو اللہ تعالیٰ اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہے لیکن پرویز صاحب نے اپنے خود ساختہ تصور تقدیر کو تقویت پہنچانے کے لئے اس آیت کا سہارا لے کر قرآن کریم کی

متعدد آیات کا انکار کیا پس پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بنائے ہوئے قوانین کو کبھی نہیں بدلتا قطعی طور پر غلط ہے بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بنائے ہوئے قوانین کو جب چاہے تبدیل کر سکتا ہے اور تبدیل کرتا بھی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ انسان ایک مرد اور ایک عورت کے اختلاط سے پیدا ہو لیکن آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے جبکہ حوا علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے صرف مرد یعنی آدم علیہ السلام سے پیدا کیا اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو صرف عورت سے پیدا کیا اور یحییٰ علیہ السلام کو بوڑھے باپ اور بانجھ ماں سے پیدا کیا، یہ سب مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قوانین کو جب چاہتا ہے تبدیل کرتا ہے اسی کو عرف عام میں معجزہ یا خرق عادت کہا جاتا ہے یعنی وہ بھی اللہ کا قانون ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے اسکا ثبوت یہ ہے کہ مسئلہ تقدیر سے متعلق احادیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہونے والا تھا وہ سب لوح محفوظ میں پہلے سے لکھا ہوا تھا یعنی تمام معجزات اور خرق عادت امور بھی پہلے سے لکھے ہوئے تھے اس اعتبار سے تمام معجزات بھی قانون الٰہی کا ایک حصہ ہوئے مزید برآں پرویز صاحب نے ''مشیت'' کو جو ناقابل تبدیل بتایا ہے وہ غلط اور قرآنی آیات کے خلاف ہے اسی طرح لفظ ''لو'' کا جو مفہوم کتاب التقدیر میں لکھا ہے کہ ''لو کے معنی ہیں اب یہ بات کبھی نہیں ہوگی'' قرآنی آیات کے سراسر خلاف ہے۔

قانون مشیت یا تقدیر:

پرویز صاحب اپنی کتاب التقدیر میں صفحہ ۱۹۵ پر قانون مشیت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

﴿ اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اسکا جواب اسکے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا اس مقام پر مشیت خداوندی ہمارے تصورات کے مطابق کسی قاعدہ اور قانون میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی، یہ خدا کا عالم امر ہے جہاں ہر شئی اسکی اسکیم کے مطابق وجود میں آتی ہے یعنی اسکی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے اور اسکے لئے قوانین مقرر ہوتے ہیں یہ سب خدا کے اقتدار مطلق کی رو سے

ہوتا ہے، یہی قوانین عالم خلق میں کارفرما ہیں، اگر کوئی پوچھے کہ پانی نشیب کی طرف کیوں بہتا ہے، آگ حرارت کیوں پہنچاتی ہے، سنکھیا مہلک کیوں ہے تو اسکے جواب میں اسکے سوا اور کچھ نہیں کہا جائے گا خدا کی مشیت ہی ایسی تھی یعنی یہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے جو مشیت خاوندی کی رو سے عالم امر میں مقرر ہوئے تھے ﴾

یہاں پرویز صاحب نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ کائنات جس طریقہ پر چل رہی ہے یہ مشیت خداوندی ہے جیسا کہ پانی کا نشیب کی طرف بہنا، آگ کا حرارت پہنچانا، سورج کا مشرق سے نکلنا اور مغرب میں غروب ہونا اور چاند کا اپنی منزلیں طے کرنا وغیرہ یعنی پرویز صاحب نے کائنات کے جس نظام کو مشیت خداوندی سے تعبیر کیا ہے اسی کو اہل سنت کی اصطلاح میں تقدیر کہا جاتا ہے، جس طرح بقول پرویز صاحب ایک بچہ ماں کے بطن میں قانون مشیت کے مطابق پرورش پاتا ہے پھر پیدا ہونے کے بعد قانون مشیت کے مطابق اپنی عمر کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی مقررہ عمر کو پہنچ کر دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر جاتا ہے تقدیری امور میں سے ہے اسی طرح اپنی زندگی کے دوران انسان جو اعمال کرتا ہے اہل سنت کے نزدیک وہ بھی تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر تمام انسانوں کے ہر عمل سے اس وقت بھی واقف تھا جب انسان پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور اپنے اسی علم کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے بارے میں اسکے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ کر دیا ہے اب اگر انسان کتاب مکنون میں لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق اعمال کرتا ہے تو اس سے جبر کہاں لازم آتا ہے بلکہ پرویز صاحب نے مشیت کی جو تعریف کی ہے کہ ''ارادہ کے مطابق جب کوئی چیز وجود میں آجائے تو اسے مشیت کہتے ہیں'' اس اعتبار سے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق ہر انسان کا مومن یا کافر ہونا، شقی یا سعید ہونا اور جنتی یا جہنمی ہونا لکھ دیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کتاب مکنون وجود میں آچکی تو پھر لازمی طور ہر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی مشیت سے مومن یا کافر ہے بصورت دیگر یہ نتیجہ نکلے گا کہ معاذ اللہ علم الٰہی ناقص ہے اور کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر بھی ہو سکتی ہے، پس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کسی انسان کا ایمان لانا یا کفر کرنا قطعی طور پر ناممکن ہے ورنہ یہ عقیدہ کہ اسکی مشیت کے بغیر کوئی انسان ایمان لاسکتا ہے یا کفر کرسکتا ہے صریح طور پر توحید کے منافی ہوگا کیونکہ اس سے یہ

ثابت ہوگا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر بھی کچھ ہوسکتا ہے اور کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرسکتا خواہ اسکا تعلق کسی بھی مکتب فکر سے ہو، نیز یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو انسان کفر کرتا ہے اسکو کفر کے اختیار کرنے کا اختیار کس نے دیا، اسکو بتوں کی عبادت کرنے کی توفیق کس نے دی جن پاؤں سے چل کر اس نے بتوں کی عبادت کی وہ پاؤں کس نے دیئے، جن ہاتھوں سے اس نے بتوں کو بنایا کھڑا کیا اور سجدہ کیا وہ ہاتھ اور سر کس نے دیئے، کیا اللہ ان کو روکنا چاہتا تو روک نہیں سکتا تھا؟ اگر پرویز صاحب کا جواب یہ ہے کہ روک سکتا تھا تو پھر سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں روکا اور جب باوجود طاقت کے ان کو اللہ تعالیٰ نے شرک وکفر سے نہیں روکا تو ظاہر ہے کہ ان کو شرک وکفر کرنے کی خود اجازت دی، اور جب ایسا ہے تو پھر یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ کفر وشرک اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے اور قرآن مجید میں اس بات کی شہادت موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکھف میں فرمایا:

﴿ وقل الحق من ربكم فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر ﴾

یعنی ''اے نبی کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے'' اس آیت میں اس بات کی پوری وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں کا ایمان لانے یا نہ لانے کی پوری آزادی ہے لیکن وہ اس آزادی کو کس طرح استعمال کریں گے یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کائنات کے پیدا کرنے سے قبل ہی موجود ہے لہذا قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے کوئی بھی شخص جو عمل کرے گا اسکا وہ عمل نوشتہ تقدیر کے عین مطابق ہی ہوگا اور پیدائش سے لیکر موت تک جو حالات بھی اسے پیش آئیں گے وہ تمام بھی اسی کتاب مکنون میں لکھے ہوئے ہیں اس بات کو ایک آسان مثال سے اسطرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک استاد جو بچوں کو پڑھاتا ہو وہ بخوبی جانتا ہے کہ اسکے زیر تعلیم بچوں میں سے کون جماعت میں اول آئے گا، کون صرف پاس ہوگا اور کون فیل ہوگا لیکن اس استاد کے اندازہ کے صحیح ثابت ہونے پر کوئی یہ نہیں کہتا کہ بچوں کو محنت کرنے اور امتحان دینے کی کیا ضرورت تھی یہ نتیجہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا اسی طرح اللہ تعالیٰ کو ہر انسان کے بارے میں علم ہے بلکہ اس سے ہزار اور لاکھ گنا زیادہ علم ہے جتنا ایک استاد کو ہوسکتا ہے نیز اللہ تعالیٰ کا اندازہ کبھی غلط بھی نہیں ہوسکتا یعنی کسی بھی انسان کا ماضی، حال اور مستقبل بیک

وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتا ہے خواہ وہ انسان ابھی پیدا بھی نہ ہوا ہو اس صورت میں ہر انسان کے بارے میں اسکی پیدائش سے قبل ہی جنت یا جہنم کا فیصلہ صادر ہو جانا اتنا ہی صحیح ہے جتنا ایک عدالت کا جرم ہو جانے کے بعد اور مجرم پر جرم ثابت ہو جانے کے بعد سزا کا فیصلہ سنانا صحیح ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح ہوتا ہے کیونکہ عدالت فیصلہ سنانے میں غلطی کر سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہر غلطی سے مبرا اور خطاء سے پاک ہے، پس اللہ تبارک وتعالیٰ کا کسی چیز یا شخص کے مستقبل کے بارے میں پیشگی فیصلہ کر دینا قطعاً غلط نہیں اور اسی چیز کا نام تقدیر یا قضا وقدر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کے بارے میں یہ جاننا کہ وہ کافر پیدا ہوگا اور کافر ہی مرے گا یا اسکے برخلاف مسلمان پیدا ہوگا اور مسلمان ہی مرے گا یا مسلمان پیدا ہوگا اور کافر ہو کر مریگا یا کافر پیدا ہوگا اور مسلمان ہو کر مریگا وغیرہ اور اپنے اس علم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے یہ لکھ بھی دیا ہو تو اس سے کونسا محال لازم آجائے گا نیز اگر کسی کا کافر کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کیوں پیدا کیا اور اسکو لوگوں کے گمراہ کرنے کی اجازت کیوں دی، پرویز صاحب لغات القرآن ص ۱۹۹ ج ۲ میں لکھتے ہیں کہ ''یھدی من یشاء'' کے معنی اگر یہ کئے جائیں کہ ''اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے'' تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے رہنمائی اسکے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہے یعنی من یشاء کے معنی قانون مشیت کے ہوں گے پرویز صاحب نے یہاں جس چیز کو قانون مشیت کہہ کر تسلیم کیا ہے اسی چیز کو اہل سنت تقدیر کہتے ہیں گویا اب یہاں صرف لفظی فرق رہ گیا یعنی پرویز صاحب تقدیر کو قانون مشیت کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں اور چونکہ انھیں قرآن حدیث کی اصطلاحات سے چڑ ہے اس لئے وہ ایک نئی اصطلاح ایجاد کر کے لوگوں کو بے وقوف بنانا چاہتے ہیں۔

انسان کے اندر نیکی اور بدی میں تمیز کی استعداد:

پرویز صاحب لغات القرآن میں لفظ ''لھم'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

﴿ قرآن کریم سورۃ الشمس میں نفس کے متعلق ہے ''فالھمھا فجورھا وتقواھا'' اس کے عام طور پر معنی کئے جاتے ہیں کہ ''اللہ نے فطرت انسانی کے اندر نیکی اور بدی، خیر وشر

حق و باطل کی تمیز کی استعداد رکھدی ہے'' یہ معنی بوجوہ غلط ہیں کیونکہ کائنات میں انسان کے علاوہ ہر شئی کو بطور جبلت اس راستہ کی راہنمائی کی گئی ہے جس پر اسکو چلنا ہے مثلاً پانی کی فطرت میں ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے، بکری کی جبلت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت سے پرہیز کرے اگر انسان کے اندر بھی اسی طرح خیر و شر کی تمیز رکھدی جاتی تو ہر انسان ایک ہی راستہ پر چلتا جس طرح بکری گھاس ہی کھاتی ہے اور اسمیں اسکے اختیار اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورت حال ایسی نہیں یعنی ہر انسان ایک ہی راستہ پر نہیں چلتا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق اور باطل کی تمیز انسان کے اندر داخل نہیں کی گئی، بلکہ اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے اندر وہ قوتیں بھی رکھدی گئی ہیں جن کی رو سے یہ اس انتشار سے محفوظ رہ سکتی ہیں، یہ نفس کی کیفیات ہیں اس لئے اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس انسانی میں ہر دو ممکنات رکھدیئے گئے ہیں اسکے بعد انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمر قوتوں کو نشو ونما دیکر انہیں کس راستے پر صرف کرتا ہے وہ ان سے اپنی ذات کی نشو ونما کا کام لیتا ہے یا اس کی تخریب کاری اور تدسیہ کا''

پرویز صاحب کی یہ عبارت انکے اپنے موقف کے بالکل خلاف جاتی ہے، بقول پرویز صاحب انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک خیر کی اور دوسری شر کی اور انسان اپنی مرضی سے ان دونوں قوتوں میں سے ایک بروئے کار لاتا ہے، پرویز صاحب کا یہ موقف اس وقت درست ہوسکتا ہے جب انسان کے اندر ان دونوں قوتوں کے درمیان تمیز و تفریق کرنے کی صلاحیت ہو اور اسکے اندر ایسی قوت موجود ہو جس سے وہ پہچان سکے کہ اسکے لئے فلاں چیز خیر اور فلاں چیز شر ہے، قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا یہی معنی و مفہوم ہے مگر پرویز صاحب نے اس بات کی نفی کردی اور صاف صاف لکھدیا کہ اس آیت کا یہ معنی بوجوہ غلط ہے اور پھر غلط کی جو وجہ یہاں بیان کی ہے اس میں انسان اور حیوان، انسان و جمادات کے مابین جو فرق ہے اسکو وجہ اعتراض قرار دیا یعنی انسان کے برعکس حیوان ایک مقرر راستے اور خط پر چلتے ہیں جوان کے لئے مقرر

کیا گیا ہے اس سے ادھر ادھر ہونے کی طاقت نہیں مگر انسان خود مختار پیدا کیا گیا ہے وہ حیوانوں کی طرح کسی خاص راستے اور خط پر چلنے کا پابند نہیں ہے وہ ان دو راستوں میں سے ایک راستہ اپنی خوشی اور مرضی سے منتخب کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر خیر وشر کے مابین تمیز کی طاقت موجود ہے پرویز صاحب کی یہ دوسری بات ان کی پہلی بات کی نفی کرتی ہے، پرویز صاحب کی پہلی بات کہ ''انسان میں حق وباطل کے مابین تمیز کی طاقت موجود نہیں'' یہ موقف قرآنی آیت ''فالھمھا فجورھا وتقواھا'' کے صریح خلاف ہے اور خود پرویز صاحب کے اگلے موقف کی نفی بھی از خود ہوتی ہے جس میں انھوں نے کہا کہ ''نفس انسانی میں ہر دو ممکنات رکھ دیئے گئے ہیں اسکے بعد انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمر قوتوں کو نشو ونما دیکر انہیں کس راستے پر صرف کرتا ہے'' پرویز صاحب یہاں جن دو ممکنات کا ذکر کر رہے ہیں انہیں کو حق و باطل کہا جاتا ہے اور جن قوتوں کو نشو ونما دینے کی بات کر رہے ہیں وہ خیر وشر میں تمیز کی قوتیں ہی کہلاتی ہیں اسکے بعد صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ ان قوتوں میں سے کوئی ایک قوت دوسری قوت پر غالب کب اور کیسے آتی ہے اسکا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق جس کی تقدیر میں ہدایت لکھی ہے اسکے لئے ہدایت کے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں اور جس انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم تھا کہ وہ گمراہی قبول کرے گا اسکے لئے گمراہی کے راستے کھول دیئے جاتے ہیں یا آسان کر دیئے جاتے ہیں جن پر چل کر وہ جہنم تک پہنچ جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس بات کی قطعی کوئی حاجت نہیں کہ وہ کسی انسان کو جنت یا جہنم میں داخل کرنے لئے لازمی طور پر دنیا میں پیدا کرے پھر اسکے اعمال کو دیکھے اور اسکے لئے جنت یا جہنم کا فیصلہ کرے اسکے بجائے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی بھی روح کو دنیا میں بھیجے بغیر ہی محض اپنے علم کی بنیاد پر جنت یا جہنم میں داخل کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کسی انسان کے بارے میں یہ فیصلہ قطعی طور پر منصفانہ اور درست ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ العلیم ہے اور وہ بخوبی جانتا ہے کہ کون دنیا میں جانے کے بعد کیا کرے گا اسی سبب ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بلوغت سے قبل فوت ہو جانے والے افراد کو جنتی کہنے سے منع فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ فوت ہونے والا انسان اگر زندہ رہتا تو کس طرح کا عمل کر کے موت سے ہمکنار ہوتا مزید برآں صحیح اسلامی عقیدہ کے مطابق ہر قوت خواہ وہ خیر پر مشتمل ہے خواہ شر پر اسکا خالق اللہ تعالیٰ ہے اس لئے ان دو قوتوں میں

سے جوقوت انسان پرغالب آجاتی ہے اسکو غالب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اسلئے یہ کہنا کہ طاقت ورقوت کوانسان خود طاقت ور بناتا ہے اور کمزور قوت کوانسان خود کمزور کرتا ہے عقیدہ توحید کے منافی ہے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ونفس وماسواها فالهمها فجورها وتقواها قد افلح من زكاها وقد خاب من دساها ☆ سورة الشمس﴾

یعنی ''قسم ہے نفس کی اور اسکے بنانے اور سنوارنے والے کی، پھراس نے اس نفس کوفرمابرداری اور نافرمانی دونوں باتیں سمجھادیں، بیشک کامیاب ہوا وہ شخص جس کواللہ نے پاکیزہ کردیااور نقصان میں ہوا وہ شخص جس کورب تعالیٰ نے ہدایت سے محروم کردیا'' یہاں ''دساھا'' کامعنی پرویز صاحب نے کیا ہے''اسکو دبادیا''یعنی اسکوضعیف وناتواں کردیا حالانکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کے تزکیہ اور تدسیہ کواپنی طرف منسوب کیا ہے اس اعتبار سے یہ آیت انسان کے مکمل طور پر بااختیار ہونے کی نفی کرتی ہے لیکن پرویز صاحب اور انکے ہمنوا اس آیت کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ''کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ کرلیااور خسارہ میں ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو دبادیا حافظ ابن کثیرؒ نے ان دونوں ترجموں کو صحیح کہا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسان اللہ کی توفیق کے بغیر خود بخود ہدایت حاصل کرسکتا تو اسکو اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرنے کی کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ نماز کے اندر سورۃ فاتحہ کے ذریعہ ہدایت طلب کرنے کاحکم بھی نہ دیتا نیز اگر ہر شخص حق وباطل میں بذریعہ عقل تمیز کرسکتا تو انبیاء کرام کے سلسلہ کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی اسکے بجائے صرف کتاب نازل کردی جاتی اور لوگ اس پرعمل کرلیا کرتے پس معلوم ہونا چاہیے کہ ہدایت وہدایت سے محرومی دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت سے محروم کرتا ہے اوراس ہدایت پانے وہدایت سے محرومی کی بنیاد اللہ کا علم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئے کومحیط ہے۔

خیروشر کی قوتوں پر اختیار کا مسئلہ:

تفسیر ابن کثیر میں سورۃ الشمس کی مذکورہ بالا آیت ''فالھمھا فجورھا وتقواھا'' کے ضمن میں ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو یہ بات بتادی ہے کہ یہ اسکے لئے خیر ہے اور یہ اسکے لئے شر ہے'' امام مجاہدؒ، قتادہؒ، ضحاکؒ اور امام ثوریؒ نے اس آیت کی بھی یہی تفسیر کی ہے اور سعید بن جبیرؒ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے اس آیت کی وضاحت سورۃ الدھر کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے ''اناھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا'' حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسکی اچھائی اور برائی سمجھا دی ہے، ائمہ تفسیر میں سے عکرمہ، عطیہ، ابن زید اور مجاہد سے یہی منقول ہے اسی کی تائید سورۃ فصلت کی آیت ''واما ثمود فھدیناھم فاستحبوا العمی علی الھدیٰ'' یعنی ہم نے قوم ثمود کو سیدھی راہ بتادی تھی مگر انھوں نے ہدایت اندھے رہنا پسند کیا، اسی طرح کی بات سورۃ البلد میں کہی گئی کہ ''وھدیناہ النجدین'' یعنی ہم نے انسان کو خیروشر دونوں راستے بتادیئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر خیروشر کی قوتیں برابر کی سطح پر موجود ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان خیر کی قوت کو شر کی قوت پر غالب کر کے بروئے کار لاسکتا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ انسان کے لئے ایسا کرنا ذاتی طور پر ممکن نہیں بلکہ اسکو اللہ تعالیٰ سے اس کام میں مدد کی ضرورت پڑتی ہے، علمائے اہل سنت نے لکھا ہے کہ انسان شرعی امور کا اس وقت مکلّف ہوتا ہے جب کسی شرعی کام کے انجام دینے کے لئے اسمیں ظاہری استطاعت موجود ہو اس ظاہری استطاعت سے مراد انسان کا روبصحت ہونا، عاقل و بالغ ہونا اور شرعی امور کے انجام دینے کے لائق ہونا اس قسم کی ظاہری استطاعت اس بات کے لئے کافی ہے کہ انسان کو شرعی امور پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے جیسا کہ حج کے لئے قرآن نے استطاعت کو شرط قرار دیا ہے اس قسم کی استطاعت کو علما اہل سنت استطاعت قبل الفعل کہتے ہیں اسی قسم کی استطاعت کے بارے میں قرآن نے کہا کہ ''اللہ کسی کو اسکی استطاعت سے بڑھکر تکلیف نہیں دیتا'' اس ظاہری استطاعت کے باوجود کسی عمل کے انجام دینے کے لئے ایک اور استطاعت کی ضرورت پڑتی ہے جسے اہل علم استطاعت مع الفعل کہتے ہیں اور اسی استطاعت کو توفیق الٰہی بھی کہا جاتا ہے اسکے بغیر کوئی انسان نیکی

کا عمل نہیں کرسکتا، سورۃ الاعراف آیت ۴۳ میں اسی توفیق کا ذکر ہے فرمایا:

﴿ وقالوا الحمدللہ الذی ھدانالھذا وماکنالنھتدی لولا ان ھدنااللہ ﴾

یعنی ''جنتی کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو ہدایت بخشی اگر وہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہرگز ہدایت پانے والے نہ تھے'' یعنی مومن کو عمل کرتے وقت جو توفیق نصیب ہوتی ہے جس کے باعث وہ اس عمل کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچاتا ہے اسے استطاعت مع الفعل کہتے ہیں اس استطاعت کا سوال ہر مسلمان نماز میں ''اھدنا الصراط المستقیم'' کہہ کر کرتا ہے یہاں لفظ [اھدنا] میں جس ہدایت کی دعا کی جاتی ہے وہ عام ہدایت نہیں کیونکہ عام ہدایت تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو حاصل ہوتی ہے اسلئے یہاں مخصوص ہدایت کا سوال ہے جو صرف مومنین کو عنایت ہوتی ہے اسی طرح یہ استطاعت مع الفعل سلب بھی کی جاسکتی ہے جیسا کہ قرآن کریم سورۃ یونس میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے بارے میں بددعا نقل کی ہے کہ:

﴿ وقال موسیٰ ربنا انک آتیت فرعون وملاہ زینۃ واموالا فی الحیاۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم ☆ سورۃ یونس ۸۸ ﴾

یعنی ''موسیٰؑ نے کہا اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اسکے سرداروں کو مال ودولت عطا کیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، اے اللہ تو اس کا مال برباد کردے اور اسکا دل سخت کردے تاکہ وہ ایمان نہ لائے'' پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا قبول کرلی جو اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دل سخت کردیتا ہے پھر وہ دل ایمان کے قابل نہیں رہتے یعنی اگر ایسی بات نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کسی کے دل کو سخت نہ کرتا تو موسیٰ علیہ السلام یہ دعا نہ کرتے یعنی فرعون نے جب استطاعت قبل الفعل سے فائدہ اٹھا کر ہدایت کے راستے پر قدم آگے بڑھانے کا آغاز نہیں کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں آگے بڑھتا چلا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بددعا کی اور فرعون کی استطاعت مع الفعل سلب کرلی گئی۔

ہدایت کی تین اقسام:

اہل سنت علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح استطاعت دوقسم پر ہے اسی طرح ہدایت بھی تین اقسام پر ہے،اولاً صرف صحیح راستے کی نشاندہی کردینا بھی ہدایت کہلاتا ہے ،ثانیاً ہاتھ پکڑ کر صحیح راستہ پر کھڑا کردینا بھی ہدایت کہلاتا ہے اور ثالثاً راستے پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچادینا بھی ہدایت کہلاتا ہے،قرآن کریم میں یہ لفظ تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وانک لتھدی الی صراط مستقیم صراط اللہ الذی لہ مافی السموات ومافی الارض ☆ سورۃ الشوریٰ ٥٢ ﴾

یعنی ’’اے نبی ﷺ !بے شک آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں،اس اللہ کے راستے کی طرف جس کی ملکیت آسمان اور زمین ہیں‘‘ یہاں لفظ [لتھدی] راستہ دکھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد راستہ پر لا کھڑا کرنا یا منزل مقصود تک پہنچانا نہیں ہے،سورۃ القصص آیت ٥٦ میں فرمایا کہ:

﴿ انک لاتھدی من احببت ولکن اللہ یھدی وھواعلم بالمھتدین ﴾

یعنی ’’اے نبی ﷺ ! آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ جسے چاہے ہدایت دے سکتا ہے اور وہ ہدایت کے مستحقین کو بخوبی جانتا ہے‘‘ یہاں ہدایت سے مراد ہدایت کے راستہ پر لا کھڑا کرنا ہے اسلئے نبی کریم ﷺ سے اسکی نفی کی گئی ہے یعنی ان دونوں آیتوں میں باہم کوئی تعارض نہیں بلکہ ہدایت کی دومختلف سطحوں کا بیان ہے ایک محض راستہ دکھادینا جو نبی کا منصب ہے اور دوسرے راستہ پر لا کھڑا کرنا جو صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے اور منزل مقصود تک پہنچانا بھی اللہ کی جانب سے اسلئے ہر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہوئے ہم ’’اھدنا الصراط المستقیم‘‘ کہتے ہیں اور یہاں سورۃ الفاتحہ کی مذکورہ میں لفظ [اھدنا] سے تیسرا معنی مراد ہے یعنی انسان دعا کرتا ہے کہ اے اللہ سیدھی راہ پر چلا کر ہمیں منزل مقصود تک لے جانا کیونکہ پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے وہ سیدھی راہ پر چل کر مسجد تک آچکا ہے لہذا اب نماز میں ہدایت کی دعا کا مقصد منزل مقصود تک پہنچنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا،پس معلوم ہونا چاہیے کہ ایک ہی لفظ قرآن کریم میں

متعدد مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال ہوسکتا ہے لیکن پرویز صاحب نے اس اصول کو نہیں سمجھا اور ہر مقام پر لفظ [ہدایت] کا ایک ہی مفہوم اخذ کیا اس لئے پرویز صاحب نے یہ لکھدیا کہ قرآنی آیات میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے اور اس تضاد کو رفع کرنے کے لئے انھوں نے تصریف آیات کا سہارا لیا اور تصریف آیات کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ آیات جن کا مضمون پرویز صاحب کی عقل کے خلاف ہے ان کا مفہوم ان دیگر آیات کے تابع کردیا جائے جن کے مفہوم کو پرویز صاحب کی عقل تسلیم کرتی ہے اس طرح پرویز صاحب نے پورے قرآن کی معنوی تحریف کرڈالی۔

اللہ تعالیٰ کا قانون استدراج:

سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ واذا اردنا ان نهلک قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا ☆ سورة بنی اسرائيل ١٦ ﴾

یعنی ”جب ہم کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اسکے کھاتے پیتے لوگوں کی مالی مدد کرتے ہیں جس سے وہ دنیا میں فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں پھر انکے اوپر ہمارا عذاب بھیجنا ثابت ہوجاتا ہے اور ہم انکو ملیا میٹ کردیتے ہیں“ پرویز صاحب لغات القرآن میں صفحہ ۲۵۶ جلد ا پر لفظ ”امر“ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں لفظ ”امرنا مترفیھا“ آیا ہے تو اسکے معنی ہیں ہم مترفین کو کثرت سے مال ودولت دیتے ہیں اور یہ مترفین کون لوگ ہیں اسکی تشریح کرتے ہوئے پرویز صاحب ”ترف“ کے عنوان سے لغات القرآن میں صفحہ ۳۷۸ پر لکھتے ہیں ”اترف فلان یعنی اس نے سرکشی اختیار کرلی اور نافرمانی میں بڑھتا چلا گیا“ اسکے بعد پرویز صاحب نے لکھا ہے ”دیکھئے قرآن کہتا ہے کہ:

﴿ ومارسلنا فی قرية من نذير الاقال مترفوها انابما ارسلتم به كافرون☆ سورة سبأ ٣٤ ﴾

یعنی ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا جس کے مترفین نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تمہیں

دیکر بھیجا گیا ہے ہم اسکے منکر اور مخالف ہیں پھر اگلی آیت میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

﴿ قالوا نحن اکثر اموالا واولادا ☆ سورۃ سبأ ۳۵ ﴾

یعنی وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس مال ودولت اور افراد خاندان بڑی کثرت سے ہیں اسلئے ہم کو کون ہاتھ لگا سکتا ہے (اسکی چند سطریں بعد پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ) یہ سب مترفین ہیں جنہیں قرآن انسانیت کے بدترین دشمن قرار دیتا ہے''

پرویز صاحب کے اپنے اس بیان سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ مجرمین کو مذید دین سے دور کرنے اور دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے ہی مال ودولت واقتدار عطا کرتا ہے یہی ہے اللہ تعالیٰ کا وہ امر جس کو اہل سنت قضاوقدر اور تقدیر کہتے ہیں اسی معنی میں قرآن کی یہ آیت بھی ہے کہ:

﴿ ویمدھم فی طغیانھم یعمھون ☆ سورۃ البقرۃ ۱۵ ﴾

یعنی ''اللہ تعالیٰ انکو انکی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے'' پرویز صاحب نے لغات القرآن میں صفحہ ۱۵۳۰ پر لفظ ''مد'' کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اسکے معنی ہیں مہلت دینے اور دور تک لے جانا'' قرآن کی اصطلاح میں استدراج کہلاتا ہے اور اسی معنی میں قرآن کی یہ آیت بھی ہے کہ:

﴿ قل من کان فی الضلالۃ فلیمدد لہ الرحمٰن مدا ☆ مریم ۷۵ ﴾

پرویز صاحب نے لغات القرآن میں اسکا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ''کہو جو کوئی گمراہی میں رہے تو رحمٰن اسکے لئے مہلت کا عرصہ لمبا کرتا چلا جائے گا'' ان دونوں آیتوں میں لفظ ''یمدھم'' اور ''فلیمدد'' کا مادہ اور مصدر لفظ ''مد'' ہے اسلئے پرویز صاحب نے ان دونوں آیتوں کو اسی مد کے لفظ کے تحت ذکر کیا ہے اس اعتبار سے سورۃ بقرۃ کی مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہوا ''اللہ تعالیٰ انکو گمراہی میں ڈھیل دیتا ہے'' جس سے وہ یہ سمجھکر سرکشی میں بڑھ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہے اسی کو استدراج کہتے ہیں اور قرآن کریم میں لفظ [مکر] کا بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورہ آل عمرآن میں فرمایا کہ ''مکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین'' اس سے معلوم ہوا کہ استدراج، مکر، مجرمین کی مدد اور ڈھیل دینے کے معنی کے ساتھ یہ سب وہ قوانین ہیں جن کو پرویز صاحب قوانین فطرت کہتے ہیں اور ان میں تبدیلی کے پرویز صاحب قائل نہیں۔

''فمن شاء'' کی تفسیر ابن عباسؓ سے:

سورۃ الکھف کی آیت ''فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر'' کی تشریح تفسیر ابن جریر، تفسیر ابن ابی حاتم اور تفسیر ابن المنذر میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے کہ:

﴿عن ابن عباس فی قولہ. فمن شاء فلیئومن ومن شاء فلیکفر .یقول . من شاء اللہ لہ الایمان آمن ومن یشاء اللہ لہ الکفر کفر. وھو قولہ و ما تشاء ون الا یشاء اللہ رب العالمین☆تفسیر ابن ابی حاتم ﴾

یعنی اس آیت کا یہ معنی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے جس شخص کے لئے ایمان چاہا وہ ایمان لائے گا اور جس کے لئے کفر چاہا وہ کفر کرے گا'' اسکی تفسیر دوسری آیت میں یوں ہے کہ تم کوئی چیز نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ اسکو تمہارے لئے نہیں چاہے، اہل علم نے لکھا ہے کہ اللہ کی مشیت اور رضا میں فرق ہے مشیت الٰہی میں اسلام اور کفر دونوں شامل ہیں جبکہ اللہ کی رضا میں کفر داخل نہیں ہے جیسا کہ سورۃ الزمر میں فرمایا کہ:

﴿ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم ولایرضی لعباد ہ الکفر ☆۷﴾

یعنی ''اگر تم کفر کرو تو اللہ کو اسکی کوئی پرواہ نہیں مگر وہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا'' لیکن کفر اللہ کی مشیت سے خارج نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی کفر کرے تو کہا جائے گا کہ اللہ نے اسکو کفر کرنے کے چھوٹ دی تب اس نے کفر کیا یعنی اگر اللہ اپنی مشیت سے کفر کی اجازت نہ دے تو کوئی انسان کفر نہیں کرسکتا اس اعتبار سے ابن عباسؓ نے ''فمن شاء فلیئومن ومن شاء فلیکفر'' کی جو تفسیر کی وہ صحیح ہے کہ کوئی بھی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر نہ ایمان لاسکتا ہے اور نہ ہی کفر کرسکتا ہے لیکن اگر کسی شخص کو کفر پر موت آئے تو اسکے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اللہ کی مرضی یہی تھی کیونکہ مرضی کا تعلق رضا سے ہے اور اللہ تعالیٰ کفر پر راضی نہیں ہے یہاں لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب انسان کا کفر اللہ کی مشیت سے ہے تو پھر اللہ تعالیٰ انسان کو جہنم میں کیوں ڈالے گا؟ اسکا جواب اس آیت میں ہے کہ:

﴿اولئک الذی اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ ☆ سورۃ البقرۃ ۱۶ ﴾

یعنی اللہ کے کفر چاہنے یا اللہ کی مشیت سے فلاں نے کفر کیا ہے کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کفر کرنے کی اجازت دی جیسے اسکو اسلام لانے کی اجازت دی پھر اس نے اپنی مرضی و اختیار و خوشی سے اسلام کو چھوڑ کر کسی جبر و اکراہ کے بغیر کفر کا راستہ اختیار کیا یعنی ''یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے'' اسلئے یہ لوگ عذاب کے مستحق ہیں۔

تقدیر کے بارے میں وارد احادیث کی قرآن سے تائید:

سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قل کل یعمل علی شاکلته فربکم اعلم بمن هو اهدی سبیلا﴾

یعنی ''کہہ دیجئے ہر ایک اپنی ''شاکلہ'' پر عمل کرتا ہے اور تمہارا رب سیدھی راہ پر چلنے والوں کو خوب جانتا ہے'' یہاں شاکلہ کے کیا معنی ہیں اسکے لئے ہم ایک بار پھر پرویز صاحب کی لغات القرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿''الشکال'' اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کے اگلی اور پچھلی ٹانگیں باندھی جاتی ہیں تا کہ وہ اس حد تک قدم اٹھا سکے جس حد تک یہ رسی اجازت دے۔ ''شکل الدابة'' اس نے جانور کی ٹانگیں شکال سے باندھ دیں۔ ''الشکال فی الرحل'' وہ رسی جس سے کجاوہ کے اگلے اور پچھلے بندھنوں کو ملا کر باندھا جائے﴾

اسی مادہ سے اسم فاعل ''شاکل'' ہے جس کی مونث ''شاکلة'' ہے اسکے معنی ہوئے باندھنے والی اسکا مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر نظر کرنی چاہئے کہ کائنات میں ہر چیز کے اندر اسکی ممکنات رکھدی گئی ہیں جیسا کہ آم کی گٹھلی مین یہ امکانی قوت رکھدی گئی ہے کہ وہ مناسب نشو ونما کے بعد آم کا تناور درخت بن جائے جس میں آم جیسا رنگین وخوشبودار پھل آئے لیکن کیکر کے بیج اگر چہ درخت بن جاتا ہے لیکن اس میں کانٹے لگتے ہیں یعنی آم کی گٹھلی کا منتہٰی آم کا پھل ہے اور کیکر کے بیج کا انجام کانٹے دار درخت ہے ان میں سے کوئی اپنی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس کا امکان اسکے اندر ہوتا ہے جس طرح ایک جانور اس حد سے

آ گے نہیں بڑھ سکتا جس تک اسکی شاکلہ یعنی اسکی رسی اسکو پہنچا سکتی ہے اور یہی مذکورہ بالا آیت کا مطلب ہے کہ ہر شئے صرف اپنی شاکلہ تک ہی پہنچ سکتی ہے اس سے آگے نہیں جا سکتی یہاں تک پرویز صاحب کی بات معقول اور سلف صالحین کے موافق ہے لیکن اس سے آگے پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ انکی اپنی ذاتی رائے اور قرآن کے برعکس بات ہے پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

﴿ خارجی کائنات میں ہر شئے کی شاکلہ متعین ہوتی ہے لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ اسکی ممکنات کی بھی ایک انتہا ضرور ہے لیکن لوگوں کی موجودہ اسٹیج اسکی آخری حد نہیں یہ [اقطار السموات والارض ☆ سورۃ الرحمٰن] سے بھی آگے جا سکتا ہے ﴾

پرویز صاحب کا انسان کو قرآن کی آیت ''قل کل یعمل علی شاکلتہ'' کے حکم سے باہر نکالنا اور یہ کہنا کہ وہ ''اقطار السموات والارض'' سے بھی آگے جا سکتا ہے قطعی طور پر غلط اور بلا دلیل ہے اور قرآن کی مذکورہ آیت کے بھی خلاف ہے کیونکہ ''اقطار'' جمع ہے ''قطر'' کی اسکے معنی ہیں ''کونہ یا کسی چیز کی حد'' یعنی اقطار سے مراد یہ کائنات اور اس کائنات کی حدود میں اللہ تعالیٰ کی حکومت مراد ہے، اس پوری آیت کا ترجمہ اسطرح ہے کہ ''اے جنات اور انسانوں کے گروہ اگر تم کو زمین و آسمان کے کناروں سے نکل جانے کی طاقت ہے تو نکل جاؤ اور بغیر طاقت و قوت کے تو تم نکل سکتے ہی نہیں ہو'' مطلب یہ کہ وہ طاقت تم کو حاصل ہی نہیں کہ تم نکل سکو یعنی تم اللہ تعالیٰ اور اسکی حکومت کو شکست نہیں دے سکتے لیکن پرویز صاحب اور ان کے متبعین نے اس آیت کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ انسان جو چاند پر پہنچا ہے وہ زمین و آسمان کے اقطار کو پار کر گیا ہے اور اس آیت میں ماضی کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ چونکہ تمہارے پاس آسمان پر جانے کے وسائل نہیں ہیں اس لئے تم وہاں تک نہیں جا سکتے اور اسمیں اشارہ ہے آنے والے لوگوں کی ترقی کی طرف کہ وہ آسمان پر وسائل کے حصول کے بعد جا سکیں گویا اس آیت میں انسان کے چاند پر جانے کی پیشگوئی ہے جو حرف بحرف پوری ہوئی ہے، یہ ان لوگوں کی تفسیر ہے جو قرآن کا ترجمہ و تفسیر لغت عرب اور صرف و نحو کے قواعد سے ہٹ کر محض اپنی عقل سے کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن میں تدبر و تفکر کرنے کا حکم ہے اور یہ حق ہر انسان کو حاصل ہے خواہ وہ عربی قواعد و لغت سے کورا ہی کیوں نہ ہو نیز سورۃ الرحمٰن کی اگلی ہی آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے

کہ اگر تم اقطار اسماوات سے نکلنے کی کوشش کروگے تو تمہارے اوپر آگ اور گرم تانبے کی بارش کردی جائے گی پرویز صاحب نے لغات القرآن میں لفظ ''قطر'' کا معنی کرتے ہوئے لکھا ہے: القطر، کنارہ، جانب، اسکی جمع اقطار، اطراف وجوانب، خلاصہ کلام یہ کہ آیت ''کل یعمل علی شاکلتہ'' کے معنی کے اعتبار سے دنیا کی تمام مخلوق بشمول انسان قضاء وقدر کے تابع ہے اور ہر ایک کے لئے اسکا راستہ اور اسکی ابتداء وانتہاء کو معین کردیا گیا ہے ہر شئے ایک دائرے میں رہے گی اسکے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے جیسا کہ سورۃ الدھر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ اناھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا﴾

یعنی ''ہم نے انسان کو راستہ دکھادیا ہے شکر کا یا کفر کا'' اس آیت کی تفسیر میں ابن عباسؓ کے مشہور شاگرد مجاہد کا قول ہے کہ ''اس سے مراد شقاوت اور سعادت ہے'' یعنی ہر ایک کو خیر وشر اور نیک بختی وبدبختی کا وہ راستہ دکھادیا گیا ہے جس پر اسکو چلنا ہے وہ اپنے مقررہ اور محدود راستے کے سوا دوسرے راستے پر نہیں چل سکتا اس لئے یہاں لفظ ''السبیل'' مفرد لایا گیا ہے تثنیہ نہیں ہے نیز یہاں ''اما'' کا لفظ ''یا'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی صحیح ترجمہ یوں ہوگا کہ ''ہم نے انسان کو ایک راستہ دکھادیا ہے یا شکر کا یا کفر کا'' اسکی تائید قرآن کی دوسری آیات سے بھی ہوئی ہے مثلاً سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ولو شاء لھدا کم اجمعین ﴾

یعنی ''اللہ چاہتا تو تم سب کو دین اسلام کی ہدایت دے دیتا'' مگر اس نے ایسا نہیں چاہا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کفر اللہ کی مشیت سے ہے، جیسا کہ سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وکذالک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم .ولوشاء اللہ ما فعلوہ فذرھم ومایفترون ﴾

یعنی ''ان مشرکین کے باطل معبودوں نے اولاد کو قتل کرنے کے عمل کو ان کی نظروں میں خوبصورت کرکے پیش کردیا ہے تاکہ ان کو برباد وہلاک کردیں اور دین کو انکے اوپر خلط ملط کردیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ کبھی ایسا عمل نہ کرتے پس انکو ان کے حال پر چھوڑدو اور انکی جھوٹی باتوں پر کان نہ دھرو'' اس آیت سے بھی

معلوم ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ کبھی ایسا عمل نہ کرتے یعنی ان کا یہ عمل اللہ کی مشیت سے تھا۔

رزق کی فراخی اور تنگی کا قضاء وقدر سے تعلق:

پرویز صاحب نے کتاب التقدیر میں صفحہ ۲۱۶، ۲۱۷ پر زیر عنوان ''من یشاء'' لکھا ہے کہ:

﴿عقیدہ جبر کی سند اور تائید میں جو آیات پیش کی جاتی ہیں وہ ہیں جن میں ''من یشاء'' کے الفاظ آتے ہیں اور اسکا ترجمہ کیا جاتا ہے ''جسے چاہے'' مثلاً:

﴿یضل من یشاء ویھدی من یشاء ☆ سورۃ النحل ۹۳﴾

یعنی ''وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''

﴿فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ☆ سورۃ البقرۃ ۲۸۴﴾

یعنی ''وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے''

﴿ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر ☆ سورۃ بنی اسرائیل ۳۰﴾

یعنی ''بے شک تمہارا رب جسکی چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کی چاہے تنگ کر دیتا ہے''﴾

پرویز صاحب نے لغات القرآن میں زیر عنوان ''و ح ی'' لکھا ہے کہ:

﴿کائنات میں ہر شئے خدا کے امر کے مطابق سرگرم عمل ہے یہ خدا کی وہ وحی ہے جو ہر شئے میں از خود ودیعت کر دی گئی ہے اسکو قانون فطرت کہتے ہیں یا جانداروں کے لئے جبلت، یہ قانون ان چیزوں کا پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے، انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے اس لئے اسکے لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اسکا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے، جہاں تک اسکی طبعی زندگی کا تعلق ہے تو اس پر بھی وہی قانون فطرت عائد ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ہے جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا اور افزائش نسل یا بیماری اور موت سب اسی

قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے اور یہ قانون اسکا اپنا وضع کردہ نہیں ﴾

اس مقام پر جس قانون فطرت کی بات پرویز صاحب نے کی ہے اور انسانوں کو اسکا تابع بتایا ہے اسی کو علماء اہل سنت نے قضاء وقدر کا نام دیا ہے جب یہ سب کچھ پرویز صاحب کو تسلیم ہے تو قضاء وقدر سے انکار کیوں ہے۔

وحی کی تعریف وتشریح:

پرویز صاحب نے لغات القرآن میں صفحہ ۱۶۹۴ جلد ۴ پر لکھا ہے کہ:

﴿انبیاء کرام کو یہ وحی کبھی اشارہ سریہ کے ذریعہ ملتی تھی اور کبھی ''من وارء حجاب'' لیکن ہمیں یہ وحی صرف رسول کی وساطت سے مل سکتی ہے اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

﴿وماکان لبشران یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب اویرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء انه علی حکیم ☆ سورة الشوری ۵۱﴾

اسمیں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے، بشر کی دو قسمیں ہیں ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء (اس آیت میں) پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتہ) کے ذریعہ پہنچتا ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا یا براہ راست پردہ کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے جیسے حضرت موسیٰ کی صورت میں ہوا، باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعہ ہی خدا کا کلام پہنچتا ہے یہ کلام قرآن کے اندر ہے اسکے باہر کہیں نہیں اس اعتبار سے یہ قرآن ہم پر بھی نازل ہوا ہے بقول قرآن ''ینزل علیکم ☆ سورۃ البقرۃ ۱۰۵'' یعنی تم سب پر نازل ہو رہا ہے﴾

پرویز صاحب نے یہاں سورۃ شوریٰ کی آیت کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ قرآن کریم کی صریح تحریف ہے کیونکہ پرویز صاحب نے اس آیت کو وہ معنی پہنائے ہیں جو کسی بھی طرح ممکن نہیں ہیں، پرویز صاحب کا

اس تحریف سے اصل مقصد انکار حدیث کے عقیدے کو ثابت کرنا ہے حالانکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کو ملنے والے علم کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں ایک قسم قرآن ہے جو بذریعہ رسول یعنی فرشتہ جبرائیل نازل ہوا جبکہ باقی دو قسمیں یعنی وحی اور پردہ کے پیچھے سے کلام کر کے جو علم نبی کو دیا جاتا ہے وہ قرآن کے علاوہ ہیں اس کو حدیث کہتے ہیں یعنی اس آیت میں وحی سے مراد وہ وحی نہیں جو جبرائیل لیکر آئے کیونکہ عربی لغت میں وحی کا معنی الہام یا اشارہ سریعہ ہے جسکو پرویز صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں اسکے باوجود پرویز صاحب نے حدیث کو نبی کریم ﷺ کے علم سے خارج کرنے لئے اس آیت کی جو تحریف کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے نیز اس اقتباس کے شروع میں پرویز صاحب نے وحی یعنی قرآن کو اشارہ سریعہ کہا ہے اور اسی عبارت میں آگے چل کر وحی کا مفہوم فرشتہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب جبرائیل سے مراد اشارہ سریعہ لیتے ہیں کیونکہ بعض دیگر مقامات پر انہوں نے فرشتوں اور جنوں کے وجود سے بھی انکار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرویز صاحب قرآن کو بلا الفاظ و آواز کے وحی باور کرتے کیونکہ جب وہ فرشتہ کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر نبی کریم ﷺ کا جبرائیل سے قرآن سننا اور یاد کرنا بھی ناممکن ہوا یعنی پرویز صاحب عقیدہ خلق قرآن پر ایمان رکھنے والوں میں سے ہیں جن کے مطابق قرآن وحی الٰہی ہے مگر بلا الفاظ و آواز ہے یعنی قرآن اللہ کی صفت نہیں بلکہ اللہ کی مخلوق ہے اور معلوم ہونا چاہیے کہ اہلسنت علماء کے نزدیک یہ عقیدہ کفر ہے جبکہ حدیث نبوی ﷺ کو پرویز صاحب ویسے ہی وحی سے خارج سمجھتے ہیں چنانچہ حدیث رسول کو وحی سے خارج قرار دیتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو جو وحی ملی تھی اسکی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو جو قرآن کے اندر ہے اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کے باہر روایات میں ہے، قرآن کریم میں وحی کی تقسیم کا کوئی ذکر نہیں ہے اسکی رو سے صرف قرآن وحی کے ذریعہ ملا ہے ﴾

یہاں پرویز صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں سورۃ الانعام کی ایک آیت کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ و اوحی الی هذا القرآن لانذر کم به و من بلغ ☆ سورۃ الانعام ﴾

یعنی ''میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تا کہ میں تم کو اسکے ذریعہ خبردار کروں اور ان لوگوں کو بھی جن کو یہ قرآن پہنچے'' اس آیت سے پرویز صاحب نے استدلال کیا ہے کہ وحی صرف قرآن ہے لیکن اس آیت میں ایسا کوئی لفظ نہیں جسکا معنی یہ ہو سکے کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے یعنی یہاں قرآن کے وحی ہونے کا اثبات ہے مگر قرآن کے باہر وحی ہونے کی کوئی نفی نہیں اس لئے پرویز صاحب کا اس آیت سے استدلال دھوکہ دہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پرویز صاحب نے چونکہ وحی کو صرف قرآن تک محدود رکھا ہے اسلئے بعض علماء اہل سنت میں کسی نے پرویز صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ جناب آپ کے والد کا آپکی والدہ سے کس وحی کی رو سے نکاح ہوا تھا جس کے سبب آپ پیدا ہوئے چونکہ موجودہ مسلمانوں کے طریقہ نکاح کا پورے قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے اسلئے منکرین حدیث کو یا تو اپنے آپ کو غیر شرعی پیدا ہونا ماننا پڑے گا ورنہ حدیث رسول کو بھی وحی ماننا ہوگا کیونکہ شریعت کا ماخذ صرف وحی ہے اور کسی کی ذاتی رائے یا ذاتی فعل شریعت نہیں بن سکتا ہے اسی طرح سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ قل لا اجد فی ما اوحیی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة او دما مسفوحا او لحم خنزیر اوفسقا اهل لغیر الله به ☆ سورة الانعام ۱۴۵ ﴾

یعنی ''اے نبی ﷺ آپ فرما دیجئے کہ میری طرف جو وحی ہوئی ہے اس میں کھانے والے کے لئے سوائے مردہ جانور، بہتے ہوئے خون، سور کے گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے جانور کے سوا کچھ بھی حرام نہیں ہے'' پرویزی نظریہ کے مطابق اگر وحی کو صرف قرآن تک محدود کر دیا جائے تو اس آیت کی رو سے مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ ہر چیز حلال قرار پائے گی مثلاً کتا، گدھا اور خود انسان بھی حلال ہو جائیں گے اور جو کوئی بھی ان کا گوشت کھائے گا اسے حرام کھانے والا نہیں کہا جائے گا۔

ایک شبہ کا ازلہ:

یہاں سورۃ انعام کی مذکورہ بالا آیت سے بعض لوگوں کو یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ جب اس آیت کریمہ میں واضح طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ ان مذکورہ اشیاء کے علاوہ وحی الٰہی میں کوئی چیز حرام نہیں تو پھر حدیث رسول ﷺ سے حرمت میں داخل ہونے والی اشیاء کے ذکر کو کیسے وحی کہیں گے یعنی ان کے علاوہ مسلمان جن اشیاء کو بھی حرام کہتے ہیں انکی حرمت کا وحی الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے اسکا جواب یہ ہے کہ سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت کے نزول کے وقت تک کوئی چیز ماسوائے اس آیت میں مذکور اشیاء کے حرام نہیں ہوئی تھی لیکن اس آیت کے نزول کے بعد بھی حلت وحرمت کے احکامات تدریجاً آتے رہے اور جن کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ احادیث میں ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ احادیث کے احکامات کا تعلق بھی وحی الٰہی سے ہے بصورت دیگر یہ نتیجہ نکلے گا کہ معاذ اللہ نبی کریم ﷺ نے ازخود وحی الٰہی کے خلاف بعض اشیاء کو حرام کیا حالانکہ خود قرآن کی رو سے اس بات کی اجازت خود نبی کو بھی نہیں ہے جیسا کہ سورۃ التحریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ یاایھاالنبی لم تحرم مااحل اللہ لک ﴾

یعنی ''اے نبی ﷺ آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے''
اس سے معلوم ہوا کہ نبی کو اس بات کا بھی اختیار نہیں کہ وہ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرے چہ جائیکہ نبی دوسروں کے لئے کسی چیز کو ازخود حلال یا حرام کرسکے پس ثابت ہوا کہ احادیث میں وارد کسی چیز کی حلت وحرمت وحی الٰہی کے سبب ہے یعنی حدیث بھی وحی کی قسم سے ہے اور اس پر بھی ویسا ہی ایمان لانا ہوگا جیسا کہ قرآن پر لایا جائے گا اسکی ایک قوی دلیل دینی احکامات بھی ہیں جیسا کہ نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ ، نکاح ، طلاق اور خرید و فروخت کے احکامات وغیرہ کی کوئی تفصیل قرآن میں موجود نہیں اب اگر قرآن کے علاوہ کوئی وحی نہیں تو نبی کریم ﷺ نے ان تمام احکامات کی تفصیل وجزیات کہاں سے لیں اگر پرویز صاحب یہ مانتے ہیں کہ یہ تمام تفصیل وجزیات نبی کریم ﷺ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے مکمل کیں ہیں تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ دین ناقص تھا جسے نبی کریم ﷺ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے مکمل کیا اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ احکامات کی عملی صورت بھی

اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی ہے تو یقینی طور پر احادیث کو وحی تسلیم کرنا پڑے گا مثلاً حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے جو حج کیا اسکا مکمل طریقہ پورے قرآن میں کہیں نہیں ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ طریقہ وحی کیا یا نبی کریم ﷺ نے خود اپنی مرضی سے وہ طریقہ مقرر کیا یا حج کا طریقہ متعین کرنے کے لئے صحابہ کرام سے مشورہ کیا گیا تھا۔

سورۃ النحل کی آیت کی پرویزی تفسیر:

سورۃ النحل آیت ۴۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم ولعلم یتفکرون ﴾

یعنی ''ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا ہے تا کہ لوگوں کے سامنے آپ اسکو کھول کر بیان کر دیں''
یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ اسکو لوگوں کے سامنے پڑھکر سنا دیں بلکہ اس ذکر یعنی قرآن کی وضاحت اور شرح و تفسیر کرنے کا حکم دیا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کی شرح کرنے کے لئے محض عقل کی ضرورت ہے تو پھر قرآن کی شرح ہر شخص اپنی عقل سے خود کر لیتا نبی کو شرح کرنے کا حکم کیوں دیا گیا صاف ظاہر ہے کہ نبی قرآن کی جو بھی تشریح کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی منشاء کے عین مطابق ہوگی اور عین مطابق اس لئے ہوگی کیونکہ نبی اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست رابطہ میں ہوتا ہے اور یہ رابطہ یقینی طور پر وحی قرآن کے علاوہ ہے جو اہل سنت کے نزدیک وحی خفی ہے ورنہ قرآن کی شرح کا حکم لایعنی بات ہوتی پس نبی کریم ﷺ نے اپنے قول و عمل کے ذریعہ قرآنی احکامات کی جو بھی شرح کی ہے وہ تمام کی تمام وحی پر مشتمل ہے اسی کو حدیث رسول ﷺ کہا جاتا ہے لیکن پرویز صاحب اس آیت کی جو شرح کرتے ہیں وہ لغات القرآن از پرویز صاحب ملاحظہ فرمائیے، وہ زیر عنوان [ب ی ن] لکھتے ہیں کہ:

﴿ ''البین'' جدائی، الگ الگ کرنا یا ہونا، البین دو زمینوں کے درمیان فاصلہ یا حد کو کہتے ہیں، بانوا بینا، وہ جدا ہو گئے، البیان کا معنی ہے کسی چیز کا کھل کر سامنے آ جانا، واضح ہو جانا، نمودار ہو جانا، صاحب محیط کے نزدیک وہ دلیل وغیرہ جس سے کوئی چیز اشکالاً اور

واضح ہو جائے بیان کہلاتی ہے ﴾

پرویز صاحب کی اس عبارت سے واضح ہے کہ قرآن کے لفظ ''البین'' کا معنی ہے کسی چیز کا واضح اور آشکارا ہو جانا اور دو چیزوں کا الگ الگ اور جدا ہو جانا اور اس اعتبار سے قرآن کے لفظ ''لتبین للناس'' کا معنی ہوا آپ ﷺ قرآن کے احکامات کو الگ الگ اور واضح کر کے لوگوں کے سامنے بیان کر دیں اور ان احکامات کی تفصیل، تشریح اور تفسیر لوگوں کے سامنے بیان کر دیں تا کہ لوگ ان احکامات کو الگ الگ طور پر یاد کر لیں مگر پرویز صاحب نے آگے چل کر جب سورۃ النحل کی اس آیت کا معنی بیان کیا تو اپنی ہی لکھی ہوئی لغت کو ایک طرف ڈال دیا اور اس آیت کریمہ کا یہ معنی کیا کہ:

﴿ ہم نے اس ضابطہ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے تا کہ جو کچھ لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے تو اسے لوگوں پر ظاہر کر دے تا کہ وہ اسمیں غور فکر کریں ☆ لغات القرآن ﴾

یہاں پرویز صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی کا منصب صرف قرآن پڑھ کر سنا دینا ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اے نبی ﷺ آپ صرف قرآن پڑھکر اپنی زبان سے انہیں سنا دیں اور ظاہر کر دیں تا کہ کوئی آیت یا کوئی سورۃ آپ ﷺ کے سینے میں چھپ کر نہ رہ جائے پھر وہ لوگ اسکا مطلب و مفہوم خود نکال لیں گے اور جو کچھ مطلب و مفہوم جس کی سمجھ میں آئے گا وہی مفہوم صحیح اور منجانب اللہ ہو گا حالانکہ جب کبھی بھی کسی گروہ یا کسی شخص نے قرآن کو حدیث سے الگ کر کے از خود سمجھنے کی کوشش کی ہے لازمی طور پر ٹھوکر کھائی ہے مثلاً خیر القرون کے دور ہی کی مثال لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ کے دور میں جن لوگوں نے زکواۃ کی ادائیگی کا انکار کیا تھا ان کا استدلال قرآن سے تھا کیونکہ سورۃ توبہ آیت ۱۰۳ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم ان صلاتک سکن لهم ﴾

یعنی ''اے نبی ﷺ آپ ان لوگوں سے صدقہ وصول فرمائیں اسکے ذریعہ ان کو پاک کریں اور زکواۃ و صدقہ لیکر ان کے حق میں دعا کریں، آپ ﷺ کی دعا ان کے لئے سکون و اطمینان کا باعث ہے'' منکرین زکواۃ نے زکواۃ کی فرضیت کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے صرف یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ہم سے زکواۃ وصول کرنے کا حکم دیا تھا اور ہم آپ ﷺ کی زندگی میں یہ صدقہ دیا

کرتے تھے لیکن اب نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو یہ زکواۃ وصول کرنے حق نہیں ہے جسکے نتیجہ میں ابو بکر صدیق ؓ نے ان لوگوں سے قتال کیا اس طرح ان لوگوں کی اس قرآن فہمی نے ان کو دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ورسوا کیا تفسیر ابن کثیر میں یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں تفصیلاً موجود ہے۔

دوسری مثال خوارج کی ہے جن کا استدلال قرآن کی اس آیت سے تھا:

﴿ ان الحکم الا للہ ☆ سورۃ الانعام ۵۷ ﴾

یعنی ''اللہ کے سوا کسی کا حکم اور فیصلہ نہیں'' خوارج نے قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے جنگ صفین کے اختتام پر علیؓ اور معاویہؓ اور بعض دیگر صحابہ کرام کو کافر قرار دیدیا کیونکہ انھوں نے علیؓ اور معاویہؓ کے مابین فیصلہ کے لئے دو صحابہ کرام کو حکم مقرر کیا تھا ان لوگوں نے کہا کہ کسی انسان کو فیصلہ کا حق نہیں کیونکہ قرآن کی رو سے فیصلہ صرف اللہ کا ہوتا ہے، قرآن کے فہم کی بنیاد عقل کو بنانے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

تیسری مثال جلیل القدر صحابی عمر فاروقؓ کا نبی کریم ﷺ کی وفات سے انکار تھا اور عمر فاروقؓ نے یہ انکار قرآن کی ایک آیت کی بنا پر کیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ وکذالک جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا ☆ سورۃ البقرۃ ۱۴۳ ﴾

یعنی ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں بنایا درمیانی امت تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہو'' تاریخ طبری میں صفحہ ۴۵۰ جلد ۱ پر ابن عباس سے روایت ہے کہ ''عمر فاروقؓ نے مجھ سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اس دن کیوں کہا تھا کہ نبی کریم ﷺ فوت نہیں ہوئے، ابن عباسؓ نے فرمایا نہیں مجھے نہیں معلوم آپ نے اس دن ایسا کیوں کہا تھا، عمر فاروقؓ نے فرمایا سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں میں نے پڑھا تھا کہ رسول ﷺ تم پر گواہی دیں گے تو میں نے اس سے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ اس امت کے آخر تک زندہ رہیں گے تا کہ اس امت کے آخری شخص پر بھی آپ گواہی دے سکیں، یہ تھی میرے یہ کہنے کی بنیاد کہ نبی کریم ﷺ فوت نہیں ہوئے'' اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے عقل معیار نہیں بلکہ اسکی تفسیر، شرح اور توضیح خود نبی کریم ﷺ کے قول و عمل سے ہونا ضروری ہے یعنی اگر قرآن سمجھنے میں عمر جیسے شخص کو غلطی لگ

سکتی ہے تو پھر کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ قرآن کو محض اپنی عقل کی بنیاد پر سمجھ سکتا ہے بی بی عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کا خلق کیا تھا تو بی بی عائشہؓ نے فرمایا آپ ﷺ کا خلق قرآن تھا یعنی آپ کا عمل قرآن کی تفسیر تھا پس جو شخص قرآن کو بغیر حدیث کے سمجھنے کی کوشش کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔

کیا تصوف، تناسخ اور ثنویت مسئلہ تقدیر کا نتیجہ ہیں؟:

پرویز صاحب نے ایک عیسائی تھامس ایکوینس کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

﴿اگر شر کا وجود خدا کی مرضی سے ہے تو وہ خدا خیر مطلق نہیں ہو سکتا اور اگر شر خدا کی مرضی کے علی الرغم موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں کہلا سکتا ☆ کتاب التقدیر ص ۱۲۶﴾

پرویز صاحب تصوف کا مسلک گوتم بدھ کی ایجاد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

﴿گوتم بدھ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ دنیا ہے ہی مصائب و آلام کا گھر اور ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کا اسکے سوا کوئی علاج نہیں کہ انسان دنیا کو ترک کر دے اور اس حد تک ترک کر دے کہ اسکے دل میں کوئی آرزو تک پیدا نہ ہو، جب دنیا کی طرف سے قطع علائق کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو وہ کامل عدم احساس کی منزل میں داخل ہو جائے گا جسے ''نروان'' کہتے ہیں بعد میں ان کے ان تاثرات نے فلسفہ کی شکل اختیار کر لی جو اڑھائی ہزار سال سے انسانیت کے اعصاب پر چھایا ہوا ہے۔ چونکہ دنیا نام ہے جہان آب و گل یعنی ''مادہ'' کا اسلئے اس سے یہ کلیہ مستنبط کیا گیا کہ مادہ ایک دلدل ہے جس میں انسانی روح بری طرح پھنس گئی ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ روح کو مادہ کی اس قید سے چھڑا دیا جائے، اسکا طریقہ ترک دنیا ہے اور یہ مقصد مختلف ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے اس مسلک کو ''تصوف'' کہتے ہیں ☆ کتاب التقدیر ص ۱۲۷﴾

مسئلہ تناسخ کا سبب بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ہندی مفکروں نے جب اس سوال پر غور کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ کچھ لوگ دنیا میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسرے لوگ ساری عمر مصائب و تکالیف میں مبتلا رہتے ہیں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جن لوگوں نے اپنے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے تھے انہیں موجودہ جنم میں خوش گواریاں میسر آتی ہیں اور جنہوں نے برے کام کئے تھے وہ مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں یہ نظریہ درحقیقت آواگون یعنی عقیدہ تناسخ ہی کا دوسرا نام تھا جو فکر یونان کی پیداوار تھا☆ کتاب التقدیر ص ۱۲۸﴾

عقیدہ ''ثنویت'' کو بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب نے لکھا:

﴿ایرانی دانشوروں نے کہا کہ دنیا میں دو مستقل اور باہم گرمتضاد قوتیں ازل سے برسر پیکار ہیں، ایک ظلمت یعنی تاریکی کی قوت جسے ''اہرمن'' کہتے ہیں اور دوسری نور یعنی روشنی جسے ''یزداں'' کہا جاتا ہے، ان دونوں میں ہر آن جنگ جاری رہتی ہے جسے خیر و شر کی کشمکش کہتے ہیں یہ ثنویت قدیم ایرانی مجوسیوں کا مذہب ہے☆ کتاب التقدیر ص ۱۲۸﴾

یہاں پرویز صاحب نے ان عقائد کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تمام باطل مذاہب دراصل خیر اور شر دونوں کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان رکھنے کا نتیجہ تھے اسکے بعد پرویز صاحب کتاب التقدیر میں فکر قرآنی کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ ''خیر منجانب اللہ ہے جبکہ شر انسان کے اپنے اعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے'' لیکن تبویب القرآن میں اس مسئلہ کو لاینحل بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

﴿خیر و شر کا مسئلہ اس وقت سے فلسفہ کا موضوع بنا چلا آ رہا ہے جس وقت سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے لیکن اسکا کوئی اطمینان بخش حل ابھی تک انہیں نہیں مل سکا، قرآن کریم اس فلسفیانہ بحث میں نہیں الجھتا، وہ کہتا ہے کہ اشیاء کائنات ہوں یا انسان کی اپنی صلاحیتیں ان میں سے کوئی بھی شے فی ذاتہ نہ خیر ہوتی ہے نہ شر ان کا استعمال انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے☆ تبویب القرآن ص ۱۱۷﴾

یعنی پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق خیر و شر کا خارج میں کوئی وجود نہیں بلکہ یہ ہر انسان پر منحصر

ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے اپنے لئے خیر بنالے اور جس چیز کو چاہے شر بنالے اس کا صاف طور پر یہ مطلب نکلتا ہے کہ پرویز صاحب اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کا خالق تو مانتے ہیں لیکن عامل نہیں مانتے یعنی ان کے خیال میں یہ کائنات بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کائنات کو قوانین کے حوالے کر کے خود لاتعلق ہوگیا ہے نیز کائنات کے قوانین کا یہ نظریہ اگر مان بھی لیا جائے تو اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوانین بنانے والا کون ہے؟ یقیناً اللہ تعالیٰ ہے تو پھر خیر وشر کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہوا قرآن اس معاملہ میں کہتا ہے کہ:

﴿ ولو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر لقضی الیھم اجلھم فنذر الذین لایرجون لقاء نا فی طغیانھم یعمھون☆سورۃ یونس ۱۱﴾

یعنی ”اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے شر میں اتنی جلدی کرتا جتنی جلدی وہ خیر کی طلب میں کرتے ہیں تو انکی مہلت پوری ہوجاتی ، پس ہم ان لوگوں کو جو اللہ سے ملاقات کا یقین نہیں رکھتے سرکشی میں پڑا چھوڑ دیتے ہیں“ یعنی خیر وشر دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

﴿ کل نفس ذائقۃ الموت ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون ☆ سورۃ الانبیاء۳۵﴾

یعنی ”ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تمہیں خیر اور شر کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے اور تم کو ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے“ ان آیات سے معلوم ہوا کہ خیر اور شر دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اس لئے پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ ”اگر شر کا وجود خدا کی مرضی سے ہے تو وہ خدا خیر مطلق نہیں ہوسکتا اور اگر شر خدا کی مرضی کے علی الرغم موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں کہلا سکتا“ پرویز صاحب کا توحید اسماء وصفات پر ایمان نہ ہونے کا نتیجہ ہے علماء اہل سنت والجماعت نے توحید کی تین اقسام بیان کی ہیں ۱۔توحید ربوبیت یعنی جو کچھ بھی انسان کو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے بظاہر اس کا مہیا کرنے والا کوئی بھی ہو مگر حقیقت میں اسکا عطاء کرنے والا صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے گویا اسکے شکر وتعریف کا اصل حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہے ۲۔توحید الوہیت یعنی معبود صرف اللہ کو سمجھنا دراصل یہ توحید ربوبیت کا ایک منطقی نتیجہ ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کو حقیقی رب مانا جائے تو عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہیے اور کوئی بھی دوسرا اس عبادت میں ہرگز شریک نہیں ہونا

چاہیے ۳۔توحیداسماء وصفات یعنی جب کسی کوحقیقی رب ماناجائے اوراسی کی اطاعت وبندگی خلوص دل کے ساتھ کی جائے تو پھرضروری ہوجاتا ہے کہ انسان اس ہستی کے اسماءاور صفات سے بھی واقف ہوتا کہ اسے اسکے صحیح ناموں اورشایان شان صفات سے پکار سکے ورنہ شرک میں مبتلا ہوجانے کاقوی امکان ہوتاہے اور توحیداسماء وصفات کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے جوبھی اسماء وصفات بیان کئے ہیں ان پرمن وعن ایمان رکھاجائے اوران میں سے کسی صفاتی نام کی کوئی تاویل نہ کی جائے اوران تمام اسماء وصفات کوصرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں بیک وقت اور ہمہ وقت باتمام وکمال اورقائم ودائم ماناجائے حتیٰ کہ متضاد صفات مثلاً الھادی یعنی ہدایت دینے والااورالمضل یعنی ہدایت سے محروم کرنے والااسی طرح الرحمٰن یعنی انتہادرجہ میں رحم کرنے والااورشدیدالعقاب یعنی سخت سزادینے والاوغیرہ جیسی صفات بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں بیک وقت اور ہمہ وقت موجودہوتی ہیں اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ خیرمطلق بھی ہےاورقادرمطلق بھی یعنی خیر کا خالق بھی ہےاورشر کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہےاس اسماء وصفات کےعقیدہ کوسامنے رکھتے ہوئے اب اگر ہم مذکورہ بالا باطل مذاہب کا جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ تصوف نے نفس انسانی یاجسم یامادہ کوشر کاخالق قرار دیااور خیرکوروح کا خاصہ قراردیاجس کے نتیجہ میں روحانیت حاصل کرنے کاتصور پیدا ہواجسکامنطقی نتیجہ بلآخرتصوف یارہبانیت کی صورت میں سامنے آیااسی طرح آواگون یاتناسخ کانظریہ بھی خیراورشرکاخالق انسان کوسمجھنے کاایک نتیجہ ہے کیونکہ اس نظریہ کےمطابق جوانسان خیرکواختیارکرتاہے وہ اپنے آئیندہ جنم میں چین اورراحت کی زندگی گذارتاہےجبکہ جوانسان شرپھیلاتاہےوہ اپنے اگلےجنم میں اسکانتیجہ بھگتاہےیعنی خیریاشراختیارکرنے میں انسان مطلق آزادہےاوراپنے تمام اعمال خواہ وہ خیرہوں یاشرپرمشتمل ہوں انسان کی اپنی تخلیق ہیں (انسان کی طرف تخلیق عمل کی نسبت درست نہیں)لہذاان اعمال کےمکمل بدلے کابھی انسان خودہی حق دارہےاورشریاخیرکےاکثراعمال ایسے ہیں جن کے بدلے کے لئے ایک جنم ناکافی ہےمثلاًایک آدمی نےسوآدمیوں کاقتل کیالیکن بدلے میں اسکوصرف ایک بارہی قتل کیاجاسکتاہےپس آخرت پرایمان نہ ہونے کی وجہ سےعقلی طورپرقاتل کابارباجنم لینااورقتل ہوناضروری قرارپاتاہےیعنی تناسخ کانظریہ آخرت کی جزاوسزاپرایمان نہ ہونے اورخیروشرکاخالق انسان کوماننے کاایک افسانوی نتیجہ ہےاسی طرح

ثنویت کا نظریہ بھی خیر وشر کے خالق علیحدہ علیحدہ یعنی ''اہرمن اور یزداں'' کو ماننے کا نتیجہ ہیں جبکہ صحیح اسلامی عقیدہ کے مطابق خیر اور شر دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے البتہ انسان اپنے علم اور عقل کی مدد سے شر سے جس قدر بچ سکتا ہو بچے اور خیر کو جس قدر ممکن ہو اختیار کرے کیونکہ علم اور عقل بھی اللہ ہی کی دین ہیں لیکن جو معاملہ غیب سے تعلق رکھتا ہو یا جس معاملے میں صحیح فیصلہ ناممکن ہو اس معاملے کو اس یقین کے ساتھ اللہ کے سپرد کردے کہ وہ ''علی کل شئی قدیر'' اور ''خیر وشر'' کا خالق ہے اس لئے صرف اللہ تعالیٰ ہی کسی چیز کے شر سے انسان کو بچا سکتا ہے اور صحیح سمت میں راہنمائی کرسکتا ہے۔

فرقہ جبریہ اور پرویزی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں:

پرویز صاحب نے اپنی کتاب التقدیر میں ''عقیدہ جبر کی تائید میں روایات'' کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جس کے تحت صحیح بخاری ومسلم اور بعض دیگر کتب سے چند احادیث نقل کیں ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جبریہ فرقہ درحقیقت انہی احادیث کی وجہ سے وجود میں آیا لیکن کتاب التقدیر کے صفحہ ۱۷۵ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

﴿امت میں اعتقاد کی بنا پر جو فرقہ سب سے پہلے وجود میں آیا وہ جبریہ فرقہ تھا﴾

حالانکہ پرویز صاحب ہر مقام پر یہ ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں کہ احادیث کی جمع وتدوین تیسری صدی ہجری میں ہوئی اس سے قبل کوئی مسلمان بھی احادیث کو قابل التفات نہیں سمجھتا تھا اور تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ تیسری صدی سے قبل ہی شیعہ، خوارج، معتزلہ اور جبریہ فرقے وجود میں آچکے تھے یعنی پرویز صاحب کی تحقیق کے مطابق اگر جبریہ فرقہ مسلمانوں کے اولین فرقوں میں سے ہے اور اس کی بنیاد احادیث پر ہے تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلمان احادیث کو دین میں حجت سمجھتے تھے ورنہ کوئی فرقہ احادیث سے کس طرح دلیل پکڑ سکتا تھا مزید برآں کوئی بھی فرقہ خواہ حق ہو یا باطل، زمانہ قدیم میں رہا ہو یا موجودہ دور میں ہو اپنی بات کو اس وقت تک عوام الناس سے نہیں منوا سکتا جب تک اسکے پاس قرآن سے بھی کوئی نہ کوئی دلیل نہ ہو لیکن پرویز صاحب نے یہاں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی

ہے کہ سارا قصور احادیث کا ہے جسکے باعث جبریہ فرقہ نے گمراہی اختیار کی حالانکہ گذشتہ صفحات میں ہم بعض ایسی آیات کو نقل کر چکے ہیں جن سے جبریہ نے استدلال کیا ہے مثال کے طور پر ایک آیات سورۃ الحدید کی ملاحظہ ہو:

﴿ ماأصاب من مصیبة فی الارض ولافی انفسکم الافی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ یسیر ☆سورۃ الحدید ۲۲ ﴾

یعنی ''روئے زمین پر یا تمہاری اپنی جان پر کوئی مصیبت اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ وہ کتاب میں پہلے سے لکھی ہوئی نہ ہو، یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے'' یہ آیت ان احادیث کی تائید کرتی ہے جنہیں پرویز صاحب نے جبریہ فرقہ کی وجہ تاسیس قرار دیا ہے اسکے باوجود کتاب التقدیر ص ۱۸۳ پر پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿ تقدیر کے مسئلہ سے متعلق کس قسم کی روایات وضع کی گئیں ان کا اندازہ دو چار مثالوں سے لگایئے جنہیں ہم احادیث کے نہایت معتبر مجموعہ سے پیش کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خداوند تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھ رکھا ہے جبکہ اسکا عرش پانی پر تھا ☆ بحوالہ صحیح مسلم

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی ☆ بحوالہ صحیح مسلم

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کا ٹھکانا نہ لکھا گیا ہو یعنی یا تو اسکا ٹھکانہ آگ میں ہے یا جنت میں ☆ بخاری و مسلم ﴾

پرویز صاحب ایک جانب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صرف ان احادیث کو قبول کریں گے جو قرآن کے موافق ہوں اور دوسری جانب وہ ان مندرجہ بالا احادیث کو بھی رد کر رہے ہیں جو قرآنی آیت کی تائید کرتی ہیں درحقیقت اصل بات یہ ہے کہ پرویز صاحب صرف ان احادیث کو قبول کرتے ہیں جو ان کے نظریہ کے

مطابق ہوں یہی کام جبری فرقہ نے کیا تھا بلکہ ہر باطل فرقہ یہی کام کرتا تھا اور کرتا ہے اور ہر وہ حدیث جس سے پرویز صاحب کے کسی خودساختہ نظریہ پر زد پڑتی ہو اسے موضوع اور جھوٹی قرار دیکر پرویز صاحب رد کردیتے ہیں خواہ وہ حدیث صحت کے اعلیٰ درجہ پر ہو اور اسکی تائید قرآن سے بھی کیوں نہ ہوتی ہو، مفہوم بیان کرنے کے نام پر پرویز صاحب کو کھلی چھٹی ہے کہ جس آیت کا جو مفہوم چاہیں بیان کریں اور احادیث کو وہ بیک جنبش قلم رد کردیتے ہیں مثال کے طور پر سورۃ الحدید کی مذکورہ بالا آیت کا پرویزی مفہوم ملاحظہ فرمائیے:

﴿ہم نے قانون بنایا ہے کہ معاشی خوش حالیاں اسے حاصل ہوتی ہیں جو انہیں خود حاصل کرنا چاہے اس سے یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ رزق کمانے کی استعداد مختلف افراد میں پیدائشی طور پر مختلف ہوتی ہیں نیز بعض خارجی حوادث کی وجہ سے ایسا ہوجاتا ہے کہ ایک شخص میں کمائی کی استعداد کم ہوجائے یا بالکل ہی جاتی رہے تو مندرجہ بالا قانون کے مطابق ایسے لوگ بڑے نقصان میں رہیں گے، یہ تمام امور ہماری نگاہ میں ہیں اسلئے ہم نے ان داخلی یا خارجی حوادث کے رونما ہونے سے پہلے ہی اپنے ضابطہ قوانین میں اس کی تلافی کا سامان رکھدیا ہے، یہ ہمارے نظام ربوبیت میں اس قسم کی شق کا رکھا جانا کچھ بھی مشکل نہ تھا ☆ مفہوم القرآن ص۱۲۸۲﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ روئے زمین پر اور ہر انسان پر آنے والی مصیبتوں کے پہلے سے کتاب میں لکھے ہونے کا تذکرہ کررہا ہے جبکہ پرویز صاحب بعض افراد کے خوشحالیوں سے محروم رہ جانے کا بدلہ قانون میں رکھے جانے کا ذکر کررہے ہیں اور کتاب کا مطلب نظام ربوبیت کررہے ہیں جو نقصان کی تلافی کررہا ہے جس تلافی کا ذکر اس آیت میں سرے سے نہیں ہے، پرویز صاحب نے اس آیت کا جو مفہوم دریافت کیا ہے لغت کے ماہرین میں سے کوئی بھی اس مفہوم کو قرآن کی اس آیت کے مطابق قرار نہیں دے سکتا بلکہ یہ پرویز صاحب کی اپنی ذہنی اختراع اور اس آیت سے ثابت شدہ مسئلہ تقدیر کے انکار کی ایک ناکام کوشش ہے ناکام اس لئے کہ مذکورہ بالا پیراگراف میں موجود پرویز صاحب کے یہ الفاظ کہ ''رزق کمانے کی استعداد مختلف افراد میں پیدائشی طور پر مختلف ہوتی ہیں'' مسئلہ تقدیر کو خود بخود ثابت کردیتے ہیں کیونکہ پیدائشی

طور پر استعداد کا مختلف ہونا تقدیر کی بنا پر ہوتا ہے یعنی جس شخص میں پیدائشی طور پر زرق حاصل کرنے کی استعداد ہی نہیں ہوگی وہ معاشی خوش حالیاں کیسے حاصل کریگا پس یہی کہا جاسکتا ہے کہ پرویز صاحب نے مفہوم کے نام پر قرآن کی تحریف کا جو نسخہ دریافت کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے بہرکیف یہاں ہم یہ بتانا چاہیے ہیں کہ جبریہ فرقہ نے تقدیر کے مسئلہ میں جو موقف اختیار کیا اگر چہ وہ بھی پرویز صاحب کے موقف کے برخلاف ہونے کے باوجود غلط تھا مگر اسکی بنیاد انھوں نے بھی پرویز صاحب کی طرح حدیث پر نہیں بلکہ قرآن پر ہی رکھی تھی مثال کے طور پر یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿ أليس الله بكاف عبده ويخوفونک بالذين من دونه ومن يضلل الله فما له من هاد ☆ ومن يهد الله فماله من مضل اليس الله بعزيز ذى انتقام ☆ سورة الزمر ۳۶،۳۷﴾

یعنی ''کیا اللہ کافی نہیں ہے اپنے بندے کیلیئے جبکہ یہ تم کو ان سے ڈراتے ہیں جو اسکے سوا ہیں، اور جسے اللہ ہدایت سے محروم کردے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں، اور جس کو اللہ ہدایت دے اسکو کوئی بھٹکانے والا نہیں ہے، کیا اللہ زبردست اور بدلہ لینے والا نہیں ہے'' یہاں اللہ تعالیٰ کو صاف طور پر ہدایت دینے والا اور ہدایت سے محروم کرنے والا کہا گیا ہے جس میں کسی دوسرے کے عمل دخل کی مطلق نفی کی گئی ہے جبکہ بعض دیگر آیات میں انسان کے ہدایت اور گمراہی اختیار کرنے کو انسان کا ذاتی کسب بھی بتایا گیا اور اس کے متعلق بعض روایات بھی ہیں جنہیں پرویز صاحب نے بغیر ان کی اسنادی حیثیت کو دیکھے اختیار کیا ہے اس اعتبار سے جبریہ اور پرویزی ایک دوسرے کے قطعی مخالف موقف رکھنے کے باوجود ایک ہی کشتی کے سوار ہیں یعنی ان دونوں نے پہلے ایک نظریہ قائم کیا پھر اس نظریہ کی بنیاد پر قرآنی آیات اور احادیث کو رد یا قبول کیا اسکے برخلاف اہل سنت یا محدثین نے ہر دو قسم کی آیات اور احادیث پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ موقف اختیار کیا کہ خیر و شر یا ہدایت و محرومی مطلق اللہ کے اختیار میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ العلیم اور الخبیر ہونے کے باعث بخوبی جانتا ہے کہ کون ہدایت کا حق دار اور کون ضلالت کا مستحق ہے اور اپنے اس علم بنیاد پر اللہ تعالیٰ انسانوں کو عمل کا موقع فراہم کرتا ہے جسکی بنیاد پر انسان کے لئے آخرت میں جزا یا سزا ہے نیز جو بھی اچھے یا برے اعمال

انسان کرتے ہیں ان اعمال کو کرنے کی قوت اور سازگار ماحول اللہ تعالیٰ ہی فراہم کرتا ہے اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی مشیت انسان کے اعمال میں شریک ہے اسکے علاوہ چونکہ شیطان نے انسان کو جہنم میں اپنے ساتھ لے جانے کی قسم کھائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے یوم الحساب تک کی مہلت دی ہے چناچہ شیطان انسانوں کو برے اعمال پر برابر اکساتا رہتا ہے اس اعتبار سے انسان کے برے اعمال میں شیطان بھی شریک ہے یعنی انہی دوگانہ اور سہ گانہ نسبتوں کے سبب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت وہدایت سے محرومی ،نیکی اور بدی اور خیر وشر کو مختلف مقامات پر مختلف نسبتوں سے ذکر کیا ہے جس کی تفصیل ہم اس کتاب کے مقدمہ میں درج کر چکے ہیں جس میں سے کسی خاص آیت یا آیات کو اصل قرار دیکر بعض کا انکار یا تاویل کرنا قرآن کے بعض پر ایمان لانے اور بعض کی تکذیب کرنے کے مترادف ہے جس کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے اور ہماری ہدایت اور ہمارے ہر اچھے عمل کو اپنی رضا کے لئے خاص کر لے آمین۔

تقدیر اور تدبیر کا باہمی تعلق:

پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

﴿چونکہ یہ عقیدہ کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے، عملی دنیا میں نہیں چل سکتا اس لئے ہم ایک کشمکش میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں کوئی شخص ہمارے کسی عزیز کو قتل کر دیتا ہے، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے مقتول کی عمر ہی اتنی تھی اسکے مقدر میں اسی طرح قتل ہونا لکھا تھا قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے، خدا کو منظور ہی ایسا تھا، زبان سے یہ کچھ کہتے جاتے ہیں اور قاتل کے خلاف استغاثہ بھی دائر کر دیتے ہیں کامیابی ہوتی ہے تو اپنی حسن تدبیر کے قصیدے پڑھتے ہیں اور ناکامی ہوتی ہے کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔

بچہ بیمار ہوتا ہے تو عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ خدا نے پہلے سے لکھا رکھا ہوتا ہے کہ اس نے کب

بیمار ہونا ہے کتنے دن بیمار رہنا ہے اور اسکا انجام کیا ہونا ہے لیکن عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کے علاج کیلئے دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، افاقہ نہیں ہوتا تو علاج بدل لیتے ہیں، وہ اچھا ہوجاتا ہے تو ہرایک سے اپنی تدبیر کی داد طلب کرتے ہیں اور معالج کی حذاقت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن وہ مرجاتا ہے تو اسے قضائے الٰہی کہہ کر پکارتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ ہم نے اسکے علاج میں تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن جب اسکی لکھی ہی اتنی تھی تو ہم کیا کرسکتے ہیں اور اگر کوئی یہ پوچھے کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ جو کچھ ہونا ہوتا ہے پہلے سے مقدر ہوتا ہے اور قسمت کے لکھے کو کوئی بدل نہیں سکتا تو تم اتنی بھاگ دوڑ کیوں کررہے تھے کیا اس سے قسمت کا لکھا بدل جاتا ہے تو اسکے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا برحق ہے لیکن تدبیر کرنا بھی فرض ہے، ہر شخص اس قسم کے الفاظ دہرا دیتا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اگر تقدیر اٹل ہے تو پھر تدبیر کیوں فرض ہے☆ کتاب التقدیر ص ۳۹۸، ۳۹۹﴾

پرویز صاحب دعا کے معنی کہیں اطاعت اور کہیں قانون کرتے ہیں اور مسلمانوں کے دعا کرنے کے مروجہ طریقہ دعا کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

﴿اگر یہ عقیدہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہوا سے خدا نے پہلے سے لکھدیا ہوتا ہے اور یہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مرجانا ہے اب اسکے لئے وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی وہ اتنے دن بیمار رہ کر مرجائیگا، اب اگر یہ کہا جائے کہ نہیں دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے کیونکہ جو فیصلہ بدل سکتا ہے خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے بدلے وہ اٹل نہیں ہوسکتا☆ کتاب التقدیر ص ۳۶۴﴾

پرویز صاحب کی ان عقلیات کا ایک سیدھا جواب جو ان منکرین تقدیر کی بولتی بند کردینے کیلئے کافی

ہے وہ یہ ہے کہ تقدیر پرایمان رکھنے والے جب یہ ایمان رکھتے ہیں ہر چیز تقدیر میں لکھی ہوئی ہے تو پھر دعا یا تدبیر کرنے والے نے جو دعا یا تدبیر کی وہ بھی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی اس لئے کسی دعا کرنے والے نے جو دعا کی اور جس وقت دعا کی اسکا اس وقت اور اس موقع پر دعا یا تدبیر کرنا بھی تقدیر میں لکھا ہوا تھا اسلئے اس نے دعا یا تدبیر کر کے تقدیر پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ:

﴿عن أبی خزامةؓ قال سئل رسول الله ﷺ أرأيت أدوية نتداوى بها ورقى نسترقى بها وتقى نتقيها هل ترد من قدر الله شيئا قال هى من قدر الله ☆ رواه ابن ماجه كتاب الطب﴾

یعنی ’’ابن خزامہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ہم مرض میں دوا کرتے اور جھاڑ پھونک بھی کرتے ہیں، کیا اسکے ذریعہ تقدیر بدل جاتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا یہ عمل بھی نوشتہ تقدیر میں ہوتا ہے‘‘ یعنی تقدیر کو تدبیر یا دعا سے بدلا نہیں جاسکتا ہے لیکن یہ تدبیر یا دعا بھی ہم جب ہی کر سکتے ہیں جب وہ تدبیر یا دعا کرنا تقدیر میں لکھا ہو یعنی تقدیر میں انسان کے اعمال کے ساتھ اسکی تدبیر یا دعا بھی لکھی ہوتی ہے اور انسان اس تقدیر کے مطابق عمل کرتے ہوئے تدبیر یا دعا کرتا ہے لیکن بظاہر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تدبیر یا دعا سے تقدیر بدل گئی اور ایسا اس لئے ہے تا کہ ایک جانب انسان مایوسی اور ناامیدی میں مبتلا نہ ہو اور دوسری جانب وہ تکبر اور خود فریبی سے بھی بچا رہے ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کسی مصیبت کے وقت اللہ کو یاد کرے گا اور نہ کسی نعمت کے حاصل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر سکے گا کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کو اسی وقت یاد کر سکتا ہے جب وہ بین الخوف والرجاء ہو یعنی اسے تقدیر کے فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے شامل ہونے کا یقین ہو اور ساتھ ہی ساتھ ان تقدیر کے فیصلوں پر اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا احساس بھی رہے اس لئے قرآن کا ہم کو مطلق حکم یہ ہے کہ ہم دعا مانگیں اور تدبیر کریں اگر ہمارے متعلقہ امر کا ہماری دعا یا تدبیر کے بعد بدلنا تقدیر میں لکھا ہوا ہے تو ہمیں اطمینان حاصل ہو جائیگا ورنہ اللہ تعالیٰ اسکے بدلے اس سے بہتر چیز ہم کو دے گا یا پھر اس دعا کا بدلہ آخرت میں ہمارے لئے محفوظ کر لے گا جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون ☆ سورۃ البقرۃ ۱۸۶ ﴾

یعنی ''اے نبی ﷺ میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں، پکارنے اور دعا کرنیوالے کی دعا کو قبول کرتا ہوں، پس لوگوں کو چاہیے کہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ یہ ان کی بھلائی کا باعث ہو'' یہاں اس آیت میں دعا کی قبولیت کا مطلق وعدہ ہے جو تقدیر کی صورت میں صرف اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب مانگنے والے کو اس سے بہتر چیز عنایت فرمادی جائے یا اسکا بدلہ آخرت میں محفوظ کرلیا جائے اس لئے پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ تقدیر پر ایمان رکھنے والوں کو دعا یا تدبیر نہیں کرنی چاہیے محض ایک لغو بات کے سوا کچھ نہیں ہے۔

منکر تقدیر کا اقرار تقدیر:

پرویز صاحب نے مسئلہ تقدیر کو باطل اور بے کار شئے قرار دینے کے لئے مکمل کتاب لکھی اور مسئلہ تقدیر کو مجوسیوں اور ہندوؤں کا مذہب بتاتے ہوئے اس سے برات کا اظہار فرمایا ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ قانون کی اطاعت کو ہی تقدیر کہتے ہیں اسکے باوجود بعض مقامات ایسے ہیں جہاں پرویز صاحب مسئلہ تقدیر کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لئے مجبور ہوگئے ہیں مثلاً کسی انسان کا بحیثیت مرد یا عورت پیدا ہونا اسکے اپنے ذاتی اختیار کی بات نہیں اسی طرح انسان کا کسی مومن یا کافر کے گھر پیدا ہونا بھی اسکے اپنے اختیار کے بات ہے اور نہ کسی قانون کے مطابق ہے ایسا صرف اللہ کی مشیت کے مطابق ہے اور اسی طرح پرویز صاحب کے نزدیک کسی کا نبی یا رسول ہونا بھی اس کے ذاتی کسب کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ جس کو چاہتا تھا اس منصب کیلئے منتخب کرتا تھا ایسے تمام مقامات پر پرویز صاحب ''من یشاء'' کا معنی وہی کرتے ہیں جو دیگر تمام اہل علم کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

﴿ خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک برگزیدہ ہستی کو اس مقصد کے لئے منتخب اور مختص کرلیتا تھا (واللہ یختص برحمتہ من یشاء) اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق

جسے چاہتا ہے اس منصب جلیلہ کے لئے مختص کر لیتا ہے☆ کتاب التقدیر ص ۲۴۰﴾

یہاں پرویز صاحب ''من یشاء'' کا معنی قانون نہیں کرتے بلکہ '' جسے چاہتا ہے'' کرتے ہیں جبکہ دیگر مقامات جہاں ان الفاظ سے تقدیر کا مسئلہ ثابت ہوسکتا ہے وہاں ''من یشاء'' کا معنی قانون کرتے ہیں اور ایسی تمام آیت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ:

﴿انسان اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے اسی کا نام قانون مکافات عمل ہے، جسے دوسرے الفاظ میں قانون مشیت کہا جاتا ہے، جن آیات میں ''من یشاء'' کا فاعل خدا ہے ان میں اسکا یہی قانون مشیت مراد ہوتا ہے☆ کتاب التقدیر ص ۳۲۲﴾

اس کا مطلب یہ ہوا کہ لفظ من یشاء کا صحیح مفہوم وہی ہے جو تمام مفسرین کے نزدیک معتبر ہے اور پرویز صاحب نے بھی مندرجہ بالا عبارت میں اسکو مجبوراً قبول کیا ہے کیونکہ اگر پرویز صاحب نبوت و رسالت کے ضمن میں بھی من یشاء کا معنی قانون ہی کرتے تو آج وہ بھی قادیانی حضرات کی قطار میں کھڑے نظر آتے، مسئلہ تقدیر کے حق اور صحیح ہونے کا یہ پرویز صاحب کے قلم سے یہ ایک پختہ ثبوت ہے اور دوسرے ثبوت کے طور پر یہ قرآنی آیت ملاحظہ فرمائیے:

﴿الذی له ملک السموات والارض ولم یتخذ ولدا ولم یکن له شریک فی الملک وخلق کل شئی فقدره تقدیرا ☆ سورة الفرقان ۲﴾

یعنی ''وہی ہے آسمان اور زمین جسکی ملکیت ہیں، اس نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ کوئی ملکیت میں اسکا شریک ہے، ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا پھر اسکی تقدیر مقرر کر دی'' یہاں لفظ ''قدره تقدیرا'' استعمال ہوا ہے جو کہ مفعول مطلق ہے جو کسی چیز کے حقیقی معنی کو بیان کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے اس کا مطلب ہوا کہ ''یہ کوئی استعارہ نہیں بلکہ حقیقی معنی میں تقدیر مقرر کی جس طرح تقدیر مقرر کی جاتی ہے'' یعنی کائنات میں موجود ہر چیز جیسا کہ حیوانات، نباتات، موجودات اور انسان کیلئے ایک تقدیر یا پیمانہ مقرر کیا کہ وہ اس طرح، اس جگہ اور اس وقت پیدا ہونگے پھر اس طرح اپنی منزلیں طے کریں گے اور ان کا اختتام اسطرح ہوگا یعنی تقدیر کا مطلب ہوگا اللہ تعالیٰ کا انسان اور کائنات میں موجود جملہ اشیاء پر مکمل کنٹرول ہے، پرویز صاحب اس

آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

﴿اس نے ہر شئے کو پیدا کیا اور پھر انکے لئے تقدیر مقرر کردی یہاں بھی تقدیر سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین ہیں☆ کتاب التقدیر ص ۵۸﴾

یہاں کتاب التقدیر تحریر فرماتے ہوئے چونکہ پرویز صاحب کے سر پر قانون کا بھوت سوار تھا اسلئے یہاں اس آیت میں ان کو تقدیر کا مطلب بھی قانون نظر آتا ہے لیکن مفہوم القرآن میں اسی آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب خود لکھتے ہیں کہ:

﴿اس نے ہر شئے کو ایک خاص ترتیب دے کر پیدا کیا اور پھر اسکے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کردیئے، انہی پیمانوں کو ان اشیاء کی تقدیر کہا جاتا ہے یعنی جو کچھ کسی شئے کے آخرالامر بن جانے کا امکان ہے وہ اسکی تقدیر ہے☆ مفہوم القرآن ص ۸۱۵﴾

یہی بات مسئلہ تقدیر کے قائلین کہتے ہیں کہ اولاً ہر شئے کو ایک خاص ترتیب دیکر پیدا کرنا، ثانیاً اسکے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کرنا، ثالثاً آخرالامر کا تعین یعنی اسکے خاتمہ کا تعین کرنا مثلاً ایک انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے، جو صلاحیتیں لیکر پیدا ہوتا ہے اور جس عقیدہ اور عمل پر اسکا خاتمہ ہوتا ہے پرویز صاحب کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر تقدیر اور کسے کہتے ہیں البتہ پرویز صاحب نے یہاں ایک لفظ ''امکان'' کو دو مرتبہ استعمال کیا ہے اور اس سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ پیمانے یا تقدیر حتمی اور یقینی نہیں بلکہ محض ایک امکان ہی حد تک ہے لیکن امکان کا لفظ اللہ تعالیٰ کے امور میں استعمال کرنا ہی غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور امکان کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی معاملہ میں انسان شک اور یقین کے درمیان ہو جبکہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کے بارے میں حتمی اور یقینی علم رکھتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ پیمانے کو امکان نہیں بلکہ تقدیر کہا جائے گا پس معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کا ہماری زندگی سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ جو لوگ تقدیر کا انکار کرتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی مقام پر مسئلہ تقدیر کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں پس جو لوگ عوام الناس کو اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا کر صحیح دین اور عقیدہ سے گمراہ اور برگشتہ کرتے ہیں وہ ابلیس کی مانند اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر پر ایک مناظرہ :

مسئلہ تقدیر پر امام ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری المتوفی ۳۳۰ھ اور جبائی محمد بن عبدالوہاب معتزلی المتوفی ۳۵۳ھ کے مابین ایک مناظرہ ہوا امام ابوالحسن اشعری نے جبائی سے کہا فرض کرو تین بھائی ہیں ان میں سے ایک بڑا کافر مرا دوسرا مسلمان اور تیسرا بچپن میں فوت ہوگیا، قیامت میں انکا حال کیا ہوگا جبائی نے کہا کافر جہنم میں جائے گا مسلمان جنت میں جائے گا اور صغیر اھل سلامت میں سے ہوگا یعنی نہ جنتی اور نہ جہنمی، اسکے جواب میں امام ابوالحسن اشعری نے کہا اگر یہ صغیر اپنے بڑے مسلمان بھائی کے ساتھ جنت میں رہنا چاہے تو رہ سکتا ہے یا نہیں، جبائی نے کہا نہیں کیونکہ اسکا عمل کوئی نہیں اللہ تعالیٰ بغیر عمل کے اسکو جنت میں نہیں رکھے گا اس پر امام ابوالحسن نے کہا اگر یہ بچہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ عمل نہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے تو نے مجھے زندگی دی ہی نہیں تو جبائی نے کہا اس سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اس میں تیرا فائدہ ہے اگر میں تجھے بڑا ہونے دیتا تو تو اپنے بڑے بھائی کی طرح کافر ہوجاتا اور سیدھا جہنم چلا جاتا اس پر یہ بچہ خاموش ہوجائے گا، امام ابوالحسن نے کہا ٹھیک ہے بچہ خاموش ہوجائے گا لیکن جب یہ بات بڑا بھائی سنئے گا تو وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ تو نے میرے چھوٹے بھائی کو بچپن میں موت دیکر اسکا بھلا کیا پھر مجھے بچپن میں موت کیوں نہیں دی تاکہ میں بھی اہل سلامت میں سے ہوجاتا یہ سن کر جبائی معتزلی لاجواب ہوگئے ملاحظہ فرمایئے سیر اعلام نبلاء ص ۱۸۴ ج ۱۴۔

خلاصہ کلام:

ہماری اس پوری کتاب کا خلاصہ اگر ایک حدیث میں بیان کیا جائے تو اس طرح ہے کہ:

﴿عن جابر بن عبداللہ قال قال رسول اللہ ﷺ لایؤمن عبد حتی یؤمن بالقدر خیر وشرہ حتی یعلم ان ما أصابه لم یکن لیخطئه وأن ما أخطأه لیصیبه ☆رواہ الترمذی کتاب القدر﴾

یعنی ’’جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں

ہوسکتا جب تک کہ تقدیر کے خیر وشر پر ایمان نہ لے آئے حتیٰ کہ یقین کرلے کہ کوئی ضرر اسے نہیں پہنچتا جب تک کہ اسکے نصیب میں نہ ہو'' اسکے برخلاف پرویز صاحب نے مسئلہ تقدیر کے ضمن میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ابتدائی طور پر تقدیر کا عقیدہ انسان نے اس وقت اختیار کیا جب وہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے نتیجہ میں نیا نیا انسان بنا تھا اسکے بعد نبوت کا سلسلہ شروع ہوا تو تقدیر کا نظریہ ختم ہوگیا لیکن پھر جب جب لوگوں نے اللہ کی طرف سے آنے والی وحی کو بھلا دیا تب تب تقدیر کا نظریہ دوبارہ پیدا ہوا حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ نے بھی نظریہ تقدیر کو دفن کر دیا لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہوگیا تو اس امت میں بھی نظریہ تقدیر پیدا ہوگیا اور تقدیر کے نظریہ سے پرویز صاحب کی مراد جبر کا عقیدہ ہے جس کے مطابق انسان کا ہر عمل خواہ وہ اچھا ہو یا برا ایک لکھی ہوئی کتاب کے عین مطابق ہے جس طرح ایک ڈرامہ کا اسکرپٹ لکھا ہوا ہوتا ہے اور ہر اداکار اس اسکرپٹ کے مطابق الفاظ اور اعمال کرتا چلا جاتا جس میں اسکی اپنی کوئی مرضی شامل نہیں ہوتی اس لئے تقدیر پر ایمان کے نتیجہ میں جزا اور سزا کا مسئلہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے لیکن تقدیر کے متعلق یہ تصور اولاً تو اس لئے غلط ہے کہ ایک اداکار کو اسکرپٹ کے مکمل طور پر پابند ہونے کے باوجود اپنے کام میں بہترین یا بدترین ہونے کے اعزاز سے ضرور نوازا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ مکمل پابندی کے باوجود بھی یقیناً کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا ذمہ دار ہر اداکار خود بھی ہوتا ہے اس اعتبار سے اگر تقدیر کا مطلب جبر بھی سمجھا جائے تب بھی جزا اور سزا سے انکار ممکن نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ مسئلہ تقدیر کو جبر سے تعبیر کرنا اور یہ سمجھنا کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ نے لکھی ہوئی ہے اور ہم اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہیں صحیح نہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ العلیم، الخبیر اور عالم الغیب ہونے کے باعث ہماری ہر بات اور ہر حرکت ہماری پیدائش بلکہ اس کائنات کی بھی پیدائش سے قبل جانتا ہے اور اسے اپنے پاس ایک کتاب میں لکھ دیا ہے جسے قرآن نے کتاب مکنون کہا ہے اور اب ہم اپنے ہر عمل اور اپنی ہر بات سے اس کتاب کی تصدیق کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ ہم اپنے ان ہی اعمال کے ذریعہ اس کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے جنت یا جہنم تک پہنچ جاتے ہیں اس اعتبار سے ہر شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا بھی اسی کتاب میں پہلے سے لکھا ہوا ہے اسی کو تقدیر کہا جاتا ہے لیکن پرویز صاحب کے نزدیک تقدیر سے مراد قوانین فطرت ہیں جنہیں مقرر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر پابندی عائد کرلی ہے اب ان

قوانین کے خلاف اللہ تعالیٰ کچھ نہیں کرسکتا ہے۔

پرویز صاحب کے بقول تقدیر پر ایمان کے نتیجہ میں انسان اپنی گمراہی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈال دیتا ہے اسی طرح کامیابی کو انسان اپنی کاریگری کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور ناکامیوں کیلئے کہتا ہے کہ خدا کی مرضی ایسی ہی تھی چناچہ پرویز صاحب ہر کامیابی و ناکامی اور ہدایت و ہدایت سے محرومی کا ذمہ دار انسان کو خود ہی قرار دیتے ہیں حالانکہ صحیح عقیدہ تقدیر کے مطابق ہر کامیابی و ناکامی اور ہدایت و گمراہی منجانب اللہ ہوتی ہے لیکن اپنے علم کامل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور جو جس چیز کا مستحق ہوتا ہے اس کو اسی راستہ پر چلا دیتا ہے پھر انسان اپنی نیت اور محنت کے باعث اس اجر کا مستحق بنتا ہے جو اللہ تعالیٰ یوم الحساب اسے عطا کرے گا۔

پرویز صاحب کے بقول خیر و شر اور رزق کی بست و کشاد مکافات عمل اور انسان کے اپنی ذاتی کسب کا نتیجہ ہوتا ہے جبکہ عقیدہ تقدیر کے مطابق خیر و شر اور رزق کی تنگی و فراوانی منجانب اللہ ہوتی ہے اور اسکا مقصد انسان کی استقامت، عاجزی، جذبہ صبر و شکر اور عزم و ہمت کو جانچنا اور اس جانچ کو اسکے جنتی یا جہنمی ہونے پر بطور ثبوت لانا ہوتا ہے۔

پرویز صاحب کے نزدیک عزت و ذلت اور عذاب و مغفرت کا تعلق قوانین فطرت پر قابو حاصل کرنے سے ہے جس طرح آج اقوام مغرب نے اشیاء کائنات پر قابو حاصل کر کے اپنے لئے عزت اور مغفرت حاصل کرلی ہے اور پرویز صاحب کے بقول تقدیر کے عملی مفہوم کو پالیا ہے حالانکہ صحیح عقیدہ تقدیر کے مطابق یہ دنیا دار الجزاء نہیں بلکہ دار العمل ہے اس اعتبار سے یہاں کی عزت و ذلت اور یہاں کی تکلیف و راحت بھی امتحان ہیں اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذریعہ انسان کی آزمائش کرتا ہے لیکن پرویز صاحب چونکہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اسلئے ان چیزوں کو اسی دنیا میں کھینچ لائے ہیں اور اقوام مغرب کی سائنسی ترقی اور کامیابی کو آخرت کی کامیابی، عزت اور مغفرت تصور کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس قسم کی ملحدانہ سوچ سے ہم تمام مسلمانوں کو محفوظ رکھے اور دین کی صحیح سمجھ اور عمل صالح کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

☆وخلق کل شئ فقدرہ تقدیرا☆

محرف قرآن و منکر حدیث پرویز صاحب

اور

مسئلہ تقدیر

تالیف:

مولانا عطاء اللہ ڈیروی

ابوالوفاء محمد طارق عادل خان

معلومات و رابطہ:

http://www.ahya.org

mtak32@yahoo.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	موضوع	صفحہ نمبر
۱	مقدمہ	۲
۲	دین اور مذہب کا فرق	۱۵
۳	خلق اور امر کی بحث	۲۰
۴	لفظ گمراہی کا لغوی اور اصطلاحی معنی	۲۴
۵	جبر اور قدر کا بنیادی فرق	۲۹
۶	لفظ ''قانون'' کی پرویزی تشریح	۳۲
۷	تدبر اور قرآن فہمی کا پرویزی طریقہ	۳۸
۸	تقدیر کا معنی از پرویز صاحب	۴۳
۹	کیا انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت سے خارج ہے؟	۴۴
۱۰	ہدایت اور ضلالت فطرت اور تقدیر پر منحصر ہے	۴۶
۱۱	کیا تقدیر پر ایمان قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟	۴۹
۱۲	مسئلہ تقدیر پر ایمان اور صحابہ کرام کا عمل	۵۱
۱۳	مسئلہ تقدیر پر ایمان اور عمل کا باہمی تعلق	۵۳
۱۴	تقدیر کا لغوی اور شرعی معنی	۵۶
۱۵	کیا مسئلہ تقدیر میں قرآنی آیات باہم متصادم ہیں؟	۵۸
۱۶	منکرین حدیث بھی احادیث کے محتاج ہیں	۶۰
۱۷	عمر فاروقؓ کے قول ''حسبنا کتاب اللہ'' کا مطلب	۶۱
۱۸	کیا قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا؟	۶۳

نمبر شمار	موضوع	صفحہ نمبر
۱۹	پرویز صاحب اور فرقہ باطنیہ	٦٦
۲۰	تصریف آیات کا معنی و مفہوم	۷۰
۲۱	''من یشاء'' کا معنی و مفہوم	۷۰
۲۲	فراخی و تنگی رزق کا مسئلہ	۷۳
۲۳	ارادہ اور مشیت میں فرق کا بیان	۷۵
۲۴	''لوشاء اللہ'' کے مفہوم کا تعین	۸۲
۲۵	قانون مشیت یا تقدیر	۸۳
۲٦	انسان کے اندر نیکی اور بدی میں تمیز کی استعداد	۸٦
۲۷	خیر اور شر کی قوتوں پر اختیار کا مسئلہ	۹۰
۲۸	ہدایت کی تین اقسام	۹۲
۲۹	اللہ تعالیٰ کا قانون استدراج	۹۳
۳۰	''فمن شاء'' کی تفسیر ابن عباسؓ سے	۹۵
۳۱	تقدیر کے بارے میں وارد احادیث کی قرآن سے تائید	۹٦
۳۲	رزق کی فراخی اور تنگی کا قضاء و قدر سے تعلق	۹۹
۳۳	وحی کی تعریف و تشریح	۱۰۰
۳۴	ایک شبہ کا ازالہ	۱۰۳
۳۵	سورۃ النحل کی آیت کی پرویزی تفسیر	۱۰۴
۳٦	کیا تصوف، تناسخ اور ثنویت مسئلہ تقدیر پر ایمان کا نتیجہ ہیں؟	۱۰۷
۳۷	فرقہ جبریہ اور پرویزی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں	۱۱۱

نمبرشمار	موضوع	صفحہ نمبر
۳۸	تقدیراورتدبیرکاباہمی تعلق	۱۱۵
۳۹	منکرتقدیرکااقرارتقدیر	۱۱۸
۴۰	مسئلہ تقدیرپرایک مناظرہ	۱۲۱
۴۱	خلاصہ کلام	۱۲۱